کئے گئے ہیں، اور اسکی ادبی، تنقیدی، طرز نگارشی، فلسفیانہ اور سیاسی حیثیتوں تبصرہ کیا گیا ہے، آخر میں اس کے چار مشہور ڈراموں کا خلاصہ دیدیا گیا ہے، اس طرح اس میں اختصار کے ساتھ برنارڈشا کے متعلق تمام ضروری معلومات آگئے ہیں،

اصلاحاتِ اقبال از جناب بشیر الحق صاحب دسنوی عظیم آبادی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ مکتبۂ دین و دانش بانکی پور پٹنہ نمبر ۴۔

مؤلف نے چند دن ہوئے اصلاحاتِ اقبال کے عنوان سے معارف میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں بڑی تلاش و محنت سے سر اقبال مرحوم کے کلام پر خود اُن کی اصلاحوں کو جمع کیا تھا، اب اسکو کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، یہ کتاب شاعروں خصوصاً کلامِ اقبال سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

مشامِ روح از جناب تابان قادری کلکتوی تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۰ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت مجلد عہ، پتہ:۔ مکتبہ قادریہ نمبر ۲ خانقاہ شریف لین کلکتہ نمبر ۱۴،

اردو زبان کو کلکتہ سے بہت قدیم تعلق ہے، اسی کے فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان کو تالیف و تصنیف کی زبان بنایا، اس تعلق کے اثرات ہر دور میں قائم رہے، اور ہر زمانہ میں یہاں شعر و ادب کا چرچا رہا، مصنف مشامِ روح بھی اس سرزمین کے ایک ہونہار شاعر ہیں، ان کا کلام شاعری سے اُن کے فطری ذوق اور مناسبت کا شاہد ہے، اور اس میں تغزل کی تمام خصوصیات و خوبیاں موجود ہیں بعض بعض اشعار تو مصنف کے قلم سے ایسے نکل گئے ہیں کہ بے ساختہ اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں اگر اُن کی مشقِ سخن جاری رہی تو وہ نوجوان شعراء میں ممتاز جگہ حاصل کر لیں گے، لیکن ایک مجموعہ کے لئے اتنے دیباچوں، تبصروں اور تعارفوں وغیرہ کا انبار ذوقِ سلیم پر بارگزرتا ہے،

"م"

جلد ۶۸ ماہ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۱ء عدد ۶

مضامین

تصحیح:۔ (۱) معارف دسمبر ۵۰ء کے صفحہ ۴۲۲ سطر ۲ میں سہو قلم سے غلام یٰسین کے بجائے "غلام محی الدین مرحوم ابوالکلام کے بھائی" چھپ گیا ہے جو غلط ہے صحیح نام غلام یٰسین ہے جیسا کہ حیاتِ شبلی ص ۵۰۹ میں تحریر ہے، "م" (۲) معارف کے اس نمبر (دسمبر ۵۱ء) ص ۴۲۵ سطر ۹ میں "انگریزی سے ترجمہ" کے بجائے "انگریزی میں ترجمہ" پڑھا جائے، "م"

شذرات

اردو کو صوبہ متحدہ کی علاقائی زبان تسلیم کرانے کی مہم دو اداروں انجمن ترقی اردو ہند اور موتمر اردو کانپور نے اپنے ہاتھون مین لی ہے، اور دونون نے الگ الگ اپنا کام شروع کر دیا ہی، اس کام مین جس قدر ادارے بھی حصہ لین، اُس کے لئے مفید ہی ہوگا، مگر اس تحریک کو دو چیزون سے بچانے کی سخت ضرورت ہی، ایک فرقہ واریت، دوسرے آپس کا اختلاف، اس سے اصل مقصد کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہی، موجودہ فضا مین ہر وہ چیز جو غلط یا صحیح کسی فرقہ کی جانب منسوب کیجا سکتی ہو، وہ بڑی آسانی سے فرقہ وارانہ شکل اختیار کر سکتی ہی، اس سے بچانے کی صرف یہ صورت ہی کہ اس تحریک کو سیاست کے خارزار مین نہ الجھایا جائے، بلکہ خالص لسانی مسئلہ رکھا جائے، اور بلا تفریق مذہب و ملت اردو کے تمام حامیون کو اس تحریک مین شریک کرنے کی کوشش کیجائے، بلکہ ان کو برابر کا ذمہ دار بنایا جائے، جیسا کہ انجمن ترقی اردو نے کیا ہی، آج بھی ہندوؤن اور سکھون کی خاصی جماعت اردو کو اپنی زبان سمجھتی ہی، جو اس تحریک مین ضرور ساتھ دے گی، اور دے رہی ہی، اس لئے زیادہ سے زیادہ اس کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور دستخط حاصل کرنے مین بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہی،

اسی کے ساتھ خود اردو کے حامیون کے درمیان بھی اختلاف بیجا ہے، اس تحریک مین جو ادارے بھی حصہ لینا چاہین اُن کا پورا خیر مقدم اور اُن سے اشتراک عمل کرنا چاہئے، مگر تحریک کی قیادت ایک ہی ادارے کے ہاتھون مین رہنی چاہئے، اور اس کے لئے سب سے زیادہ موزون انجمن ترقی اردو ہے، طوائف الملوکی حصول مقصد کے لئے مضر ہوگی، اس مین شبہہ نہین کہ انجمن ترقی اردو ایک نیم سرکاری ادارہ ہی، اس لئے وہ اپنے کامون مین پوری طرح آزاد نہین ہے، اور اردو کی خدمت کے بعض پہلوؤن مین اس کا مسلک بھی جمہور کے نقطہ نظر

سے کسی قدر مختلف ہے، اسی لئے اس کے کارکنون نے اس کا دائرہ محض اپنی ہم خیال جماعت تک محدود رکھا ہی، مگر اس کے باوجود وہ مرحوم انجمن ترقی اردو کی جانشین اور ایک مستقل اور منظم ادارہ ہے، اور ایک طرح کی مرکزیت بھی اس کو حاصل ہے، اس لئے اس تحریک کی قیادت اسی کے ہاتھون مین رہنی چاہئے، اور دوسرے اداروں کو اس کام مین اس کا ہاتھ بٹانا چاہئے،

چنانچہ دار المصنفین اس تحریک مین انجمن ترقی اردو کے ساتھ ہے، مگر انجمن کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ دوسرے اداروں خصوصاً موتمر اردو کانپور کو اپنے ساتھ ملانے اور اس کا اشتراک عمل حاصل کرنے کی کوشش کرے، ایک ہی مقصد کے لئے دو جماعتون کا اپنا راستہ الگ الگ بنانا مناسب نہین ہے، اس اتحاد کی جانب پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اس تحریک کے سلسلہ مین آخر دسمبر مین دونون کے جو عام اجلاس الگ الگ ہونے والے ہین، اون کو مشترک ہونا چاہئے، اور باہمی مفاہمت اور صلاح و مشورہ کے بعد آیندہ کے لئے متفقہ طریق عمل طے کرنا چاہئے، ممکن ہے موتمر اردو کے کارکنون کو انجمن ترقی اردو سے کچھ شکایتین ہون، اور وہ صحیح بھی ہون، مگر اس کام مین اختلاف مناسب نہین ہے، ایک بڑے مقصد کے حصول کے لئے خفیف اور معمولی اختلافات کو بھلا دینا چاہئے، ورنہ اس سے اگر اصل مقصد کو نقصان پہنچ گیا تو یہ اردو کے ساتھ دوستی نہین، بلکہ دشمنی ہوگی،

کئی سال ہوئے حیدرآباد کے مشہور ادارے، ادبیات اردو نے اردو انسائیکلو پیڈیا کی تدوین کا کام شروع کیا تھا، اور اس کے کئی ہزار صفحے لکھے بھی جا چکے تھے، مگر یہ خالص علمی کام بھی سیاسی انقلاب کی نذر ہوگیا، اور اس کے کارکن موجودہ فضا مین اس عظیم الشان کام کو بند کرنے پر مجبور ہوگئے، مگر انھون نے اس کا ایک جز جو الف کے نمونہ کے الفاظ و اصطلاحات پر مشتمل ہے، ۱۸ × ۲۲ کی تقطیع پر [illegible] صفحات مین نفیس کاغذ اور خوبصورت ٹائپ مین بطور یادگار شائع کر دیا ہے، اردو زبان کے متعلق جو عام ذہنیت ہو رہی ہے، اس کو

دیکھتے ہوئے مستقبل مین بھی اس کام کی تکمیل کی کوئی توقع نہین، اس لئے یہ نمونہ موجودہ نسل کی ذہنیت کا اندازہ لگانے کے لئے آیندہ مرقع عبرت کا کام دے گا،

دوسری قومون کی علم پروری یہ ہے کہ انگریزون نے جن کو اسلام اور مسلمانون سے کوئی علاقہ نہین بلکہ ایک طرح کا عناد ہی ہے اسلامی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرکے شائع کردی، جو اگرچہ غلطیون سے پاک نہین ہے، پھر بھی بہت بڑی علمی خدمت ہے، اور ہماری قوم کی علم دوستی کا یہ حال ہے کہ اردو جو کروڑون ہندوستانیون کی مادری زبان ہے، اس کی خدمت کا تو سوال الگ رہا، اس کی اردو دشمنی کی بنا پر اردو کے وہ کام بھی مجبوراً بند کردینا پڑے، جو پہلے سے ہو رہے تھے، دنیا اس علم دوستی کی کیا داد دے گی؟

اس کے مقابلہ مین دوسرا رُخ یہ ہے کہ ابھی گذشتہ ہی مہینہ نالندہ مین پالی زبان کے متعلق تحقیقات کا ایک ادارہ قائم ہوا ہے، جس کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد نے فرمایا ہے، پالی ایک مردہ زبان ہے، جس کا اب ہندوستان مین کوئی بولنے والا نہین، اس کے مردہ قالب مین تو جان ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے، اور اردو جیسی زندہ اور ترقی یافتہ زبان کو زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کیا جارہا ہے، یہ ہے ہماری قوم کی ذہنیت، اور ہماری حکومت کی سیکلرزم کی حقیقت؟

ان سطور کی تحریر کے بعد انجمن ترقی اردو اور موتمر اردو مین مصالحت کی اطلاع ملی، دریہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ دونون ملکر کام کرین گی، اس وقت اس مسئلہ کو اختلاف سے بچانے کی بڑی ضرورت ہے، اس سے مختلف قسم کے خطرات کا اندیشہ ہے،

مقالات

اردو زبان کی لسانی، علمی و تمدنی اہمیت

"یہ مقالہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ یونیورسٹی مین گذشتہ اکتوبر کو پڑھا گیا"

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

حضرات! اردو زبان کا موضوع نہایت وسیع ہے، اور اس کے مختلف پہلوؤن پر بہت سے اصحاب علم و نظر لکھتے چلے آئے ہین، خصوصاً ادھر چند برسون کے اندر اس کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر اس کی حیثیت زیادہ تر سیاسی بحث و مباحثہ کی رہی ہے، اور ان مین ان خصوصیات کو بہت کم دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، جن کی بنا پر کوئی زبان ترقی یافتہ کہلائی جاسکتی ہے، جن اصحاب قلم نے ادھر توجہ بھی کی، انھون نے بھی ان پہلوؤن کا پورا احاطہ نہین کیا ہے، جن سے اردو کی جامعیت اور کمال کا پورا اندازہ ہوسکے، اور یہ معلوم ہوجائے کہ ہندوستان کی زبانون مین اردو کا کیا درجہ ہے، وہ کہان تک ایک ترقی یافتہ زبان کہلانے کی مستحق ہے، اور اس مین آیندہ ترقی کی کتنی صلاحیت ہے، اس لئے یہ مضمون درحقیقت اردو کی خصوصیات کا ایک اجمالی خاکہ ہے، جس پر مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے،

زبان کی ترقی اور کمال کے گوناگون پہلو ہین، مگر اس مقالہ مین صرف اس کے تین اہم پہلوؤن یعنی لسانی اور لغوی وسعت، علمی درجہ اور تمدنی حیثیت پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی جائے گی کہ درحقیقت کسی

زبان کی ترقی کے بنیادی عناصر، اور اس کے کمال کا اصلی معیار یہی ہین، یعنی اردو زبان لسانی، اور لغوی حیثیت سے کتنی وسیع اور قواعد کی حیثیت سے کتنی جامع اور مکمل ہے، اور اس مین دقیق علمی مباحث اور علم و فن کی کتابون کی تالیف و تصنیف کی کتنی صلاحیت ہی، اس کا علمی سرمایہ کس قدر ہے، اس مین تمدنی الفاظ کا ذخیرہ کتنا ہے، اور وہ ایک متمدن زندگی کی ضروریات کا کہان تک ساتھ دے سکتی ہے، ان تینون پہلوؤن سے ہندوستان کی زبانون مین اردو کا درجہ نہایت ممتاز ہے، آیندہ سطور مین اسکی تفصیل پیش کی جاتی ہے،

اردو زبان کی پیدائش اور اس کے اجزاء و عناصر

اردو زبان کی تعمیر اگرچہ ہندوستان مین مسلمانون کی آمد ہی کے زمانہ سے شروع ہو گئی تھی، مگر مستقل زبان کی حیثیت، اس کو مغلون کے دورِ زوال مین حاصل ہوئی، اس لحاظ سے اس کی عمر چند صدیون سے زیادہ نہین ہے، اور اس کی علمی عمر تو اس سے بھی کم ہے، زبانون کی پیدائش و ترقی کے لئے چند صدیون کی مدت بہت کم ہے، مگر اتنی مختصر مدت مین اردو نے جتنی ترقی کی ہے، اس کی مثال زبانون کی تاریخ مین مشکل سے مل سکتی ہے، اس موقع پر ہمارا مقصد، اردو کی تاریخ بیان کرنا نہین ہے، اس سے آپ حضرات واقف ہین، مختصراً اتنا کہدینا کافی ہے کہ اردو دوسری زبانون کی طرح کوئی مستقل زبان نہین تھی، بلکہ مسلمانون کے ہندوستان مین آنے کے بعد، اُن کے اور ہندوؤن کے میل جول سے پیدا ہوئی، عرب، ترک، مغل، اور پٹھان وغیرہ جب ہندوستان آئے اس وقت وہ ہندوستان کی زبانون سے ناواقف تھے، مگر ہندوستان مین مستقل بس گئے تھے، ہندوؤن سے ہر وقت کا سابقہ اور میل جول تھا، اس لئے دونون ایک دوسرے کی بات سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کچھ اپنی زبان، اور کچھ مخاطب کی زبان کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوئے، اس طرح عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری زبانون سے مل کر ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار ہوا، جس نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے، ایک مستقل زبان کی شکل اختیار کر لی، جو اردو کہلائی، اس لئے اس زبان مین مذکورۂ بالا

تمام زبانون کے الفاظ موجود ہین، مگر ہندوستانی زبانون کے الفاظ کی اکثریت ہی، مسلمانون کے بعد جو یورپین قومین ہندوستان آئین، مثلاً پرتگالی، اور انگریز ان کی زبانون کے الفاظ بھی اردو مین داخل ہوتے گئے، گو پرتگالیون کا اثر جنوبی ہند سے آگے نہین بڑھا، اور اُن کا زمانہ بھی بہت کم رہا، اس کے باوجود اردو مین پرتگالی زبان کے بہت سے الفاظ ہین، مثلاً مستری، آیا، پادری، نیلام اور بالٹی وغیرہ، اور انگریزی کے الفاظ تو اس کثرت سے ہین کہ اُن کا شمار مشکل ہے، اور ہماری ہر گفتگو مین دو چار الفاظ انگریزی کے ضرور آجاتے ہین، اُن مین سے بیشتر الفاظ اس قدر عام ہو گئے ہین کہ جنھین دیہاتی بھی بے تکلف بولتے، اور سمجھتے ہین، اور اس اخذ و استفادہ کا سلسلہ برابر جاری ہے، اور اب تک انگریزی کے نئے نئے الفاظ برابر اردو مین داخل ہوتے رہتے ہین، ہندی کا دور ابھی چند ہی دنون سے شروع ہوا ہے، مگر اس مختصر زمانہ مین اُس کے بہت سے نئے الفاظ مثلاً سماج، جنتا، نیتا، سبھاپتی، تجنو، سواگت وغیرہ اردو مین استعمال ہونے لگے ہین،

اردو زبان کی وسعت

اس تفصیل کا مقصد یہ ہو کہ اردو چونکہ مختلف زبانون سے مل کر بنی ہے، اس لئے اس کا دامن بہت وسیع ہے، اور دوسری زبانون سے اُس کے لین دین کا سلسلہ برابر جاری ہے، اس لئے آیندہ بھی ترقی کی جتنی صلاحیت اردو مین ہے، وہ ان زبانون مین نہین ہو سکتی، جو اپنا ناتہ اپنے ہی خاندان تک محدود رکھنا چاہتی ہین، اور اپنی برادری کے رائج الفاظ کو بھی جات باہر کر رہی ہین،

مفرد الفاظ اور لغات کے علاوہ، مرکب الفاظ، محاورون، کہاوتون، اور ضرب الامثال کا اتنا ذخیرہ اردو مین ہے، جس کی مثال مشکل سے کسی دوسری زبان مین مل سکتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان مین زیادہ تر اسی زبان کے محاورے وغیرہ ہوتے ہین، مگر اردو مین فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت، اور انگریزی وغیرہ کے بہت سے ضرب الامثال اور کہاوتین آگئی ہین، اس لئے اس حیثیت سے بھی اس کا دامن بہت وسیع ہے، مؤلفین لغت نے عموماً ہر لفظ کے ماتحت اُن سے متعلق محاورے اور ضرب الامثال بھی لکھدیئے ہین، اور خاص اس موضوع مستقل کتابین بھی لکھی گئی ہین،

مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے اپنی کتاب فرہنگ آصفیہ میں اس کے مندرجہ الفاظ کی تعداد اور اردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ کے تناسب کی تفصیل بھی تحریر کر دی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں کل ۵۴۰۰۹ الفاظ ہیں، ان میں سے ۲۱۶۴۴ ہندی کے ہیں، ۱۷۵۰۵ الفاظ ہیں، جو ہندی اور عربی و فارسی وغیرہ سے مل کر بنے ہیں، یہ بھی گویا ہندی ہی یا کم از کم ہندوستانی ہیں، ۵۵۴ سنسکرت کے ہیں، ۷۵۸۴ عربی کے اور ۶۰۴۱ فارسی کے، ۵۰۰ انگریزی کے، اور ۱۸۱ دوسری مختلف زبانوں کے ہیں،

اس سے معلوم ہو گا کہ اردو میں عربی و فارسی الفاظ کے مقابلہ میں ہندی کے الفاظ کی تعداد کتنی غالب ہے، اردو کے تقریباً تمام مصادر، افعال، ضمیریں اور اکثر حروف ہندی کے ہیں، اسماء و صفات البتہ عربی و فارسی کے زیادہ ہیں، جو بالکل فطری ہے، اس لئے کہ مسلمان بہت سی ایسی چیزیں اپنے ساتھ لائے تھے، جو ہندوستان میں نہیں تھیں، اس لئے اُن کے نام خواہ مخواہ عربی یا فارسی کے ہونگے، جس طرح آج سائنس کی بہت سی ایجادات و اختراعات اور انگریزوں کی لائی ہوئی چیزوں کے نام انگریزی ہیں جن کا اردو اور ہندی میں کوئی بدل نہیں ہے،

فرہنگ آصفیہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کی تصنیف ہے، اس لئے اسکے لغات کی تعداد آج سے نصف صدی پیشتر کی ہے، اور اردو کی اصلی ترقی کا زمانہ یہی ہے، اس لئے اب اُس کے الفاظ کی تعداد فرہنگ آصفیہ کے مندرجہ لغات سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے،

اردو زبان کے سابقے اور لاحقے

اردو زبان کے مرکبات اور سابقوں اور لاحقوں نے بھی اس میں بڑی وسعت پیدا کی ہے، اس میں کسی لفظ کے شروع یا آخر میں کوئی جز بڑھا دینے سے ایک نیا لفظ بن جاتا ہے، سابقے، اور لاحقے زیادہ تر آریائی زبانوں میں پائے جاتے ہیں، اردو بھی اصل و نسل کے اعتبار سے آریائی اور ہندی، فارسی اور سنسکرت وغیرہ سے مرکب ہے، اس لئے ان سب کے سابقے اور

لاحقے اردو کے حصہ میں آئے، ان سے اس میں بڑی وسعت پیدا ہوئی، مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے اپنی کتاب وضع اصطلاحات میں اسکی پوری تفصیل لکھی ہے، ان میں سے کچھ بطور مثال کے یہ ہیں،

ہندی کے سابقے:- اٹل، اچھوتا، ان بن، ان پڑھ، اَن گنت، پچ رنگا، پچ کلیان، پردیس، پرایا، تپائی، تکونا، تربھون، ترپھلا، چوپائی، چوپال، سڈول، سپوت، نڈر، نڈھال، نرادھا، نراس، مہابلی، اُمہا بھارت، وغیرہ،

ہندی کے لاحقے:- بہنا پا، بڑھاپا، مٹیالا، کوڑیالا، فراٹا، سناٹا، لڑکپن، بچپن، لہار، سنار، بنجارا، بھٹیارا، کوچوان، بچوان، پیاس، مٹھاس، سپیرا، لٹیرا، پھرتیلا، شرمیلا، پیراک، چالاک، اٹھان، لگان، سسرال، ننھیال، ددھیال، ہمالہ، شوالہ، گھٹاؤ، بڑھاؤ، بناوٹ، لگاوٹ، اجاڑ، دل، ہرا، لکھائی، پڑائی، گھٹ، بڑھت، نوتوڑ، منہ توڑ، ادھر ادھر، دھرم سالہ، گئوسالہ، ٹھنڈک، کڑک، چمکار، پھٹکار، دھونکنا، چھونکنا وغیرہ،

فارسی کے سابقے:- باقاعدہ، باضابطہ، برآمد، برآورد، بے ادب، بے اثر، پابند، پاپیادہ، پائے تخت، پامال، پس انداز، پس پا، پیشگی، پیشکار، تہ بند، تہ خانہ، خورد بین، خود پرست، خوش اسلوبی، خوش گلوئی، زیر بار، زیردست، زود رنج، زود گو، سرسبز، سرپرست، شہنائی، شہتیر، نا اتفاقی، ناانصافی، نوآموز، نوتوڑ، نیم بسمل، نیم جان، ہم آہنگ، ہمسر، اک طرف، اک مشت، وغیرہ،

عربی کے سابقے:- صاحب اختیار، ذی وجاہت، ذی حیثیت، ذی مروت، غیر موزون، غیر آباد، لاابالی، لاخیرا، میر شکار، میر مجلس، وغیرہ،

فارسی لاحقے:- معنی آفرین، نکتہ آفرین، رونق افروز، دل افروز، ہمت افزا، حوصلہ افزا، گل افشان، گوہر افشان، سایہ فگن، پرتو فگن، زنگ آلود، غبار آلود، عبرت آموز، سبق آموز، خلل انداز، رخنہ انداز، دور اندیش، عاقبت اندیش، دردانگیز، تعجب انگیز، حملہ آور، زبان آور، زبردار، بردبار، ہوگیا

دغاباز، شعبدہ باز، قمارباز، خوش باش، یارباش، فیل بان، باغبان، غاشیہ بردار، علم بردار، سربستہ، کمربستہ، ازاربند، ہتیاربند، زمین بوس، فلک بوس، دوربین، باریک بین، کارپرداز، انشاپرداز، سرپرست، حق پرست، بندہ پرور، سخن پرور، پلنگ پوش، میز پوش، فلک پیما، جادہ پیما، وغیرہ،

فارسی مین سابقون اور لاحقون سے اتنے کثیر الفاظ بنے ہین کہ اُن کے نمونے بھی اس مختصر مضمون مین نہین نقل کئے جاسکتے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ہر حرف تہجی سے کئی کئی سابقے اور لاحقے، اور اُن سے بکثرت الفاظ بنے ہین، جن سے اصحاب نظر واقف ہین،

ان کے علاوہ اردو مین بکثرت مرکبات ہین، یہ مرکبات خالص ہندی، خالص عربی، اور خالص عربی کے بھی اور اُن سے مل کر بھی بنے ہین،

خالص ہندی کے مرکبات:- اکاس بیل، باگ ڈور، جل ترنگ، چاندرات، ٹھگ بدیا، جنم پتری، چاندگہن، دیاسلائی، اچڑی مار، منہ توڑ، دھواں لپک، مکھی چوس، لال بجھکڑ، اندھیر نگری وغیرہ،

خالص فارسی کے مرکبات، پاک دامن، نیک بخت، شادی مرگ، گل روغن، اور سبزہ آغاز وغیرہ،

خالص عربی کے مرکبات:- عالیشان، میرمجلس، خیرمقدم، لطیف الطبع، صدرمقام وغیرہ،

فارسی اور ہندی کے مرکبات:- نیک چلن، گلاب جامن، سبزی منڈی، جگت استاد، گرداماد وغیرہ،

عربی اور ہندی کے مرکبات:- کفن چور، جیب گھڑی، عجائب گھر، عمرپٹہ، امام باڑہ، موتی مسجد وغیرہ،

عربی اور فارسی کے مُرکبات:- سفرخرچ، عمرقید، نازک خیال، نمک حلال،

دستخط وغیرہ،

اردو مین اس قسم کے الفاظ کا بڑا ذخیرہ ہے،

اردو مین عمل تہنید | اس سلسلہ مین ایک اور نکتہ قابلِ لحاظ ہے، وہ یہ کہ ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، اور اس کے تمام الفاظ اس کے مطابق ہوتے ہین، اور وہ بیرونی زبانون کے انھی الفاظ کو قبول کرتی ہے جو اُس کے مزاج کے مطابق ہوتے ہین، یا اُن مین تصرف کر کے اُن کو اپنے مزاج کے مطابق بنا لیتی ہے، اور جو الفاظ اس کے مزاج سے میل نہین کھاتے، اُن کو رد کر دیتی ہے، یہ تصرف لفظ کی ظاہری شکل اور معنی دونون مین ہوتا ہے، اور کبھی صرف معنی مین ہوتا ہے، اس کو عربی مین تعریب، فارسی مین تفریس، اور اردو مین تہنید کہتے ہین، اگرچہ اس عمل سے دنیا کی کوئی زبان بھی خالی نہین ہے، لیکن اردو چونکہ مختلف زبانون سے مل کر بنی ہے، اس لئے اس مین یہ عمل سب سے زیادہ ہے، جو اوس کی وسعت و ترقی کا ایک بڑا راز ہے،

اردو مین ہر زبان کے اس قسم کے بکثرت الفاظ ہین، جن مین تصرف کر کے اردو نے ان کو اپنا لیا ہے، ان الفاظ کی مثالین جن کی صورت بدل گئی ہے، مگر پرانے معنی قائم ہین، خیر سلّا، افراتفری، کسگر، راج، بک بک، جھک جھک، دبیا، ان کی اصل خیر و صلاح، افراط و تفریط، کاسہ گر، راز (بمعنی معمار) اور زق زق بق بق ہے۔

وہ الفاظ جن کی شکل قائم ہے، مگر معنی بدل گئے ہین، سیکڑون ہین، مثلاً نقد، جناب، حضرت، دولت، عادت، عرض، مقدمہ، ہتین، میزان، مذاق، اہتمام، انتظام، غلام، فرض، فوج، شکل، منظور، غرور، انکسار، عمارت، کسر، اجلاس، ضابطہ، تقریر، اقبال، ادبار، خراب، وقت، امیر، غریب، تربت، عرض، عرصہ، مدت، موضع، تجار، حلوا، وحشت، اشتہا، مبلغ اور حقہ،

انکے اصلی معنی بالترتیب پرکھنے، چوکھٹ، پیشگاہ سلطانی، ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ مین جانے، لوٹ

پھیلانے، آگے کیا ہوا، بھاری مضبوط، تول ترازو، چکھنے، غم کھانے، دھاگے مین پرونے، اٹکے، واجب کرنے، تجھند گروہ، شک و مشابہ دیکھے گئے، دھوکا، ڈھنے آباد کرنے، بٹھانے، نگاہ رکھنے والے، ثابت کرنے، سامنے آنے، پیچھے آنے، ویران، باریکی، حاکم، مسافر، مٹی، نشانہ، میدان، درازی، جگہ، بھاگنے، احسان، حیرانی، خواہش، پہنچا ہوا، اور ڈبہ کے ہین، مگر اردو مین اُن کے معنی دام کی فوری ادائگی، تنخیص لفظ، زر و مال، بربادی، پیش کرنے، عدالت کے مقدمہ، مہذب، اعداد کی جمع، ظرافت و بذلہ سنجی، انتظام کرنے، بندہ چاکر، ذمہ داری، لشکر، شکل و صورت، قبول کرنے، اپنی بڑائی کے احساس، خاکساری، بڑے مکان، عیب کی، عدالت کی نشست، قانون و قاعدہ، تقریر کرنے، خوش قسمتی، بدقسمتی، ویران و بدہیئت، مشکل دولت مند، مفلس، قبر، مقصد، مدت، گانون، تپ، حلوا، خوشامد، خوف کھانے کی خواہش، ،، وچیون کی تعداد اور حقہ کے ہوگئے ہین،[1]

اردو مین اس قسم کے فارسی اور ہندی کے سینکڑون الفاظ ہین، اسی قسم کے تصرفات ہندی اور سنسکرت کے الفاظ مین بھی ہوئے ہین، مثلاً ہندی کا تیتھو، گھڑاؤ، ہتھیاؤ، برکھا، کنولو، کمہار و یا کمہکا، چندر، درشن، چتر دھر، درت، گدھ، اور ہست، اردو مین تیہ، گھوڑا گدھا، ہاتھی، برسات، کنول، کمہار، چاند، برس، چودھری، بات، دودھ، اور ہاتھ ہوگیا، انگریزی مین لالٹین، اور ریل وغیرہ اُس کی مثالین ہین،

زبان کی ترقی کے لئے دوسری زبانون سے استفادہ ضروری ہے

دنیا کی کوئی زبان بھی اس اخذ و استفادہ اور لین دین سے خالی نہین ہے اور نہ اس کے بغیر کوئی زبان ترقی کر سکتی ہے، عربی باوجودیکہ نہایت وسیع زبان ہے، مادون، مصادر، اور مشتقات کی کثرت و وسعت مین کم زبانین اس کا مقابلہ کر سکتی ہین،

[1] حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ نے اپنے ایک مضمون تنقید مطبوعہ معارف مین اس قسم کے دو بہت سے الفاظ لکھے ہین،

مگر اس مین علمی و تمدنی الفاظ کا ذخیرہ نہین تھا، اس لئے جب دوسری قومون سے مسلمانون کا اختلاط ہوا اُن کی علمی و تمدنی ترقی کا آغاز ہوا، تو انھون نے یونانی، پہلوی، اور ترکی زبان کے سیکڑون علمی و تمدنی الفاظ و اصطلاحین بجنسہٖ یا تھوڑے تغیر کے ساتھ عربی مین منتقل کرلین، بلکہ عربی مین کچھ لاطینی اٹالین الفاظ و اصطلاحات بھی پائی جاتی ہین[1] اور یہ تمام الفاظ اس طرح عربی مین جذب ہوگئے ہین کہ مبصرین و ماہرین لغت کے علاوہ دوسرے لوگ ان کی اصل کا پتہ بھی نہین چلا سکتے، ان کو عربی مین معرب اور دخیل کہتے ہین،

عربی نے تو سنسکرت، اور ہندوستانی زبانون سے استفادہ مین بھی عار نہین کیا، چنانچہ صندل، مشک، تنبول، کافور، قرنفل، فلفل، زنجبیل، نیلوفر، جائفل، اطریفل، ہیل، شنجرہ، ہلیلج، قرفس، نیلج، نارجیل اور ارنج،

چندن، موشکا، تمول (پان)، کرن پھول (لونگ)، پپلی (سیاہ مرچ)، زرنجا بیرا (سونٹھ)، نیلوپھل، ایل (ایلاچی)، جائے پھل، تری پھل، شکھر (توتیا)، ہڑ (ہلیلہ)، کرپاس، نیل، ناریل، اور ام کا معرب ہین، ان مین مشک، زنجبیل اور کافور کے الفاظ قرآن مجید مین موجود ہین،

عربی زبان کی اسی وسعتِ قلب کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ کسی زمانہ مین بھی علم و تمدن کا ساتھ دینے سے قاصر نہین رہی، اور بغداد کی عباسی اور اسپین کی اموی حکومتون کا سارا کارخانہ جو اپنے زمانہ کی سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ حکومتین تھین اور علم و تمدن مین اس زمانہ کی کوئی حکومت اُن کا مقابلہ نہین کر سکتی تھی، عربی ہی زبان سے چلتا رہا، اسی طریقہ سے فارسی اور ترکی نے عربی سے بھی استفادہ کیا، بلکہ ان دونون زبانون کا تانا بانا ہی عربی زبان پر قائم ہے، اگر عربی الفاظ اُن سے نکال دیئے جائین، تو ان کی علمی و ادبی حیثیت ختم ہوجائے گی، اب سے کچھ دنون پہلے جب اندھی وطنیت اور قومیت کی ہوا چلی تھی، تو ان دونون زبانون

[1] عربی اور انگریزی کے لغت المفرد الدریہ مین انکی پوری تفصیل ہے،

سے عربی الفاظ کو نکالنے کی کوشش شروع ہوئی تھی، مگر بہت جلد اس کا تجربہ ہوگیا کہ عربی الفاظ نکل جانے کے بعد اُن کی حیثیت ہی بالکل ختم ہو جاتی ہے، اس لئے یہ تحریک ختم ہو گئی، اور اب دونون زبانون مین بے تکلف عربی کے رائج الفاظ استعمال کئے جاتے ہین، جس کی تصدیق ان کی کتابون، اخبارات اور رسالون سے ہو سکتی ہے،

اس زمانہ کی سب سے زیادہ عالمگیر اور وسیع زبان انگریزی ہے، مگر اس مین جس کثرت سے لاطینی اور یونانی الفاظ ہین، ان سے اس زبان کے ماہرین پوری طرح واقف ہین، بلکہ مسلمانون کے عروج کے زمانہ مین اسپین و سسلی کی درسگاہون اور جنگ صلیبی کے وسیلہ سے عربی کے جو الفاظ و اصطلاحین انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانون مین داخل ہوئی تھین، وہ بجنسہ آج تک موجود ہین، خواجہ کمال الدین مرحوم نے ام الالسنہ مین اس قسم کے الفاظ کی بڑی طویل فہرست دی ہے، گو اس مین جابجا مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، مگر اس مین شبہ نہین کہ آج بھی انگریزی مین عربی کی بہت سی علمی اصطلاحات موجود ہین، الجبرا اور الکحل سے تو ہم آپ سب واقف ہین، مسلمانون کا زیادہ واسطہ اسپین، پرتگال، سسلی، اٹلی اور فرانس سے رہا ہے، اسلئے ان تمام زبانون مین بہت سے عربی کے الفاظ ہین، شام کے مشہور فاضل کرد علی نے اپنی کتاب الاسلام و الحضارۃ العربیۃ مین اس پر ایک مستقل باب لکھا ہے، اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانون نے دوسری زبانون کے وہ الفاظ قبول کئے ہین، جن کا بدل ان مین نہین تھا، اس کے بغیر کوئی زبان ترقی کر ہی نہین سکتی، اس وصف مین اردو زبان سب زبانون سے آگے ہے، بلکہ اس کا وجود ہی مختلف زبانون کے مجموعہ سے وجود مین آیا ہے، اس لئے اس حیثیت سے وہ جس قدر وسیع زبان ہے، اور اس مین ترقی کی جتنی استعداد ہے، وہ کسی دوسری زبان مین نہین ہے،

اردو مین بولیون کا تنوع لہجون اور بولیون کے لحاظ سے بھی اردو مین بڑا تنوع اور بڑی وسعت ہے، گو ہر زبان مین مختلف طبقون کی بولیون مین کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے، لیکن یہ فرق جس قدر اردو مین ہے، کسی زبان

19

مین نہین ہے، اس مین شہری، دیہاتی، تعلیم یافتہ اور جاہل طبقون پھر خود شہر کے مختلف طبقون کی زبان مین نمایان فرق ہے، اس کی نیرنگی سرشار کے فسانۂ آزاد مین نظر آ سکتی ہے، عورتون کی زبان اور اُن کے محاورات بالکل جدا ہین، لکھنؤ کی بیگماتی زبان مشہور ہے، اس کے نمونے بھی فسانۂ آزاد مین موجود ہین، شاعری مین اس کا نمونہ ریختی ہے، اس کے سب سے اچھے اور بہتر نمونے دلی کے بعض ادیبون کی کتابون خصوصاً آغا حیدر بیگ اور مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کی تحریرون مین ملتے ہین، ان کے مجموعۂ مضامین چھپ چکے ہین،

طرز انشار کا تنوع یہی جامعیت اور تنوع اردو کے طرزِ انشار مین بھی ہے، بعض زبانین اپنی ساخت کے اعتبار سے علم و فن کے لئے زیادہ موزون ہوتی ہین، بعض شعر و ادب کے لئے، بعض بزم کے لئے مناسب ہوتی ہین، اور بعض رزم کے لئے، اردو مین ان سب کی جامعیت ہے، اس مین فلسفہ کے دقیق سے دقیق مسائل و مباحث کو بھی آسانی کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور شاعرانہ نازک خیالی بھی دکھائی جا سکتی ہے، اس سے رجز کا بھی کام لیا جا سکتا ہے اور موسیقی و ترنم کا بھی، بزم ناز کی بھی مصوری کی جا سکتی ہے، اور میدانِ جنگ کی ہونا کی بھی دکھائی جا سکتی ہے، زلزلے اور طوفانون کا شور بھی دکھایا جا سکتا ہے، اور نسیم سحر کی اٹکھیلیان بھی، غرض اردو کی انشار اور اس کے اسالیب بیان مین بڑا تنوع اور بڑی جامعیت ہے، علم و فن اور شعر و ادب کا کوئی ایسا شعبہ نہین ہے جس کا ذخیرہ اردو مین موجود نہ ہو، اس کی تفصیل آیندہ آئے گی،

مرزا غالب اور سر سید کے زمانہ سے لیکر اسوقت تک بہت سے صاحب طرز ادیب پیدا ہوئے، غالب، سر سید، حالی، شبلی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، رتن ناتھ سرشار، پریم چند، مولانا ابو الکلام آزاد، مولوی عبد الحق صاحب، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، قاضی عبد الغفار صاحب، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ اور پروفیسر رشید احمد صدیقی وغیرہ سیکڑون ادیبون مین سے چند نام ہین، ان مین ادیب و انشار پرداز بھی ہین اور مورخ و فلسفی بھی، اور ان سب کا طرزِ تحریر اور اُن کی خصوصیات جدا جدا ہین، جن سے آپ حضرات واقف ہین، اسلئے اسکی تفصیل کی ضرورت نہین ہے،

حروفِ تہجی کی وسعت

حروفِ تہجی کے لحاظ سے بھی اردو مین بڑی وسعت ہو، ہندی، عربی، فارسی، ترکی، اور انگریزی وغیرہ سب کے مخارج کے حروف اور اُن کی آوازین اس مین موجود ہین، اور اُن کی تعداد اِن تمام زبانون کے حروفِ تہجی سے زیادہ ہے[1]، اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ان تمام زبانون کے الفاظ اردو مین کھپ جاتے ہین، اور اُن کی شکل بگاڑنے کی، کم ضرورت پیش آتی ہے، دوسرا یہ کہ اردو دان ان سب زبانون کے حروف اور الفاظ کا صحیح تلفظ کر سکتے ہین، اس کے برخلاف مذکورۂ بالا زبانین بولنے والے اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان کے الفاظ کا صحیح تلفظ مشکل سے کر سکتے ہین، گو اب تقریباً سب زبانون مین دوسری زبانون کی آوازون کے لئے مرکب حروف بنا لئے گئے ہین، اس کے رسم الخط کی سب سے بڑی خصوصیت اختصار اور زود نویسی ہو، وہ لکھنے مین کم سے کم جگہ لیتا ہے، اور بہت جلد لکھا جاتا ہو، لیکن اس کے حروفِ تہجی کی کثرت اور رسم الخط کی وجہ سے اسکی تعلیم اور ٹائپ بنانے مین بعض دشواریان بھی پیدا ہوگئی ہین جن کے حل کرنے کی ضرورت ہو،

اردو قواعد کی تدوین کی تاریخ

یہان تک اردو کی لسانی و ادبی حیثیت پر گفتگو تھی، اب اس کے قواعد کے متعلق کچھ باتین کہنی ہین، یہ مسلّم بات ہو کہ اہلِ زبان کو قواعد جاننے کی ضرورت نہین ہوتی، عموماً اس کے عوام اور جہلا تک قواعد کے علم کے بغیر صحیح زبان بولتے ہین، قواعد کی ضرورت غیر اہلِ زبان کیلئے پیش آتی ہو، اسی لئے ہر زبان مین قواعد کی ترتیب دوسرون کی تعلیم کے لئے عمل مین آئی ہے، عربی نہایت وسیع زبان ہے، اس کی زمانۂ جاہلیت کی شاعری مشہور ہے، اس زمانہ مین بڑے بڑے زبان آور خطیب بھی پیدا ہوئے، اور زمانۂ جاہلیت سے لیکر اسلام کے تقریباً ایک صدی بعد تک کا سارا ادبی سرمایہ قواعد کے بغیر وجود مین آیا، بنی امیہ کے زمانہ مین جب عجمی اور رومی قومین مسلمان ہوئین، اور قرآن مجید کی تلاوت مین غلطیان کرنے لگین، اس وقت اُن کی عربی تعلیم کے لئے عربی صرف و نحو مرتب کی گئی،

[1] اردو کے حروفِ تہجی ۳۰ ہین، فارسی کے ۲۵۔ انگریزی کا ۲۶ اور ہندی کے ۳۷،

تقریباً یہی حال دوسری زبانون کے قواعد کی تدوین کا بھی ہے،

اردو کے کسی اہلِ زبان شاعر اور ادیب کو قواعد کی ضرورت نہین پیش آئی، اور وہ اسکی مدد کے بغیر صحیح اردو لکھتے اور بولتے رہے، البتہ شاعرون کو کسی قدر علمِ عروض سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے، مگر وہ بھی اس لئے کہ شاعری مین اظہارِ خیال کا دامن بہت تنگ ہے، اور اردو شاعری کی بنیاد عربی اور فارسی شاعری پر ہے، اور اس مین عروض و قوافی کے قواعد پہلے سے موجود تھے، جن کی پابندی دونون زبانون کے شعراء کرتے چلے آرہے تھے، اس لئے یہ پابندی اردو شعراء کے حصہ مین بھی آئی، لیکن زمانۂ حال کے بہت سے شعراء عروض سے واقفیت کے بغیر محض ذوق کی رہنمائی مین اچھی خاصی شاعری کر لیتے ہین، گو کبھی کبھی اس مین غلطی بھی کر جاتے ہین، اور نثر مین چونکہ کسی قسم کی پابندی نہین ہے، اس لئے اس مین قواعد سے واقفیت کی ضرورت پیش نہین آتی،

سب سے پہلے اردو قواعد کی ضرورت اہلِ یورپ کو محسوس ہوئی، جب انھون نے ہندوستان کی سرزمین مین قدم رکھا، چنانچہ اٹھارہوین صدی کے آغاز سے انیسوین صدی کے شروع تک اردو قواعد کی تمام ابتدائی کتابین، جن کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہوگی[2]، ان ہی کی لکھی ہوئی ہین، ہندوستانیون مین سب سے پہلے انیسوین صدی کے آغاز مین انشاء اللہ خان نے دریائے لطافت، اور اسی زمانہ مین حکیم احمد علی یکتا لکھنوی نے دستور الفصاحت لکھی، اس کے بعد سے ہندوستانیون مین اردو قواعد کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ شروع ہوا، اور انیسوین صدی مین بہت سی کتابین لکھی گئین، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے،

اردو قواعد مین ایک غلطی اور اسکی اصلاح

لیکن ہمارے قواعد نگار عرصہ تک ایک غلطی مین مبتلا رہے، وہ یہ کہ اردو آریائی زبان ہے، اور اس کے قواعد نہ صرف عربی بلکہ فارسی اور ہندی سے بھی مختلف اور اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہین، مگر اردو کے قواعد نگار اس مین عربی اور فارسی قواعد کی پیروی کرتے رہے، جو اردو

[2] مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی کتاب قواعد اردو مین اسکی پوری تفصیل لکھی ہے،

کے مزاج اور ساخت سے مطابقت نہ کرتے تھے، ان کی اصطلاحات کے استعمال مین البتہ مجبوری تھی، سب سے اول مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے اس روش سے ہٹ کر جدت سے کام لیا، اور نئے طرز سے اردو کے قواعد کی تدوین کی، مگر اُن کی کتاب بہت مختصر اور درسی ضرورت کے لئے تھی، تاہم اس نقش اول سے آیندہ لکھنے والون کے لئے ایک نئی راہ کھُل گئی، اس کے بعد مولوی عبد الحق صاحب نے اس کی جانب توجہ کی، اور عربی اور فارسی کے قواعد کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر، اردو کے مستقل قواعد لکھے، جو چھپ کر شائع ہو چکے ہین، پھر اسی نہج پر مولوی زین العابدین کوتانوی نے آئین اردو لکھی، ان کے علاوہ، اردو مین درسی ضرورت کیلئے قواعد کی اور بھی بہت سی کتابین لکھی گئین، اور اب ان کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے، لیکن اب بھی ایک جسوط جامع اور مکمل اور ایک مختصر بنیادی قواعد کی ضرورت ہے، جس سے اردو کی تعلیم مین سہولت پیدا ہو،

اردو لغت کی تدوین لغات کی تدوین کے متعلق کچھ زیادہ نہین کہنا ہے، اس کی تدوین بھی اردو کے قواعد کی طرح عمل مین آئی، سب سے پہلے انگریزون نے لغت کی کتابین لکھین، جو زیادہ تر معمولی درجہ کی ہین، ان مین فیلن، شکسپیر اور جان ٹی پلیٹ کی لغتین نسبتۃً اہم اور زیادہ مشہور ہین، آول الذکر لغت کی تدوین مین مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے بھی مدد کی تھی؛ اسی زمانہ مین منشی امیر مینائی نے امیر اللغات کی تدوین شروع کی تھی، مگر وہ پوری نہ ہو سکی، تاہم اسوقت اردو مین لغت کی متعدد اچھی کتابین موجود ہین، اُن مین مولوی نور الحسن صاحب مرحوم نیر کاکوروی کی نور اللغات اور خواجہ عبد المجید لاہوری کی جامع اللغات نہایت جامع و مکمل، اور کئی ضخیم جلدون مین ہین، بلکہ خاص اسلامی اصطلاحون، اردو محاورات، ضرب الامثال، اور مختلف پیشون کی اصطلاحون تک پر مستقل کتابین موجود ہین[1]، اور اس حیثیت سے بھی اردو کا دامن وسیع ہو گیا ہے؛

---

[1] جلال لکھنوی، خواجہ عبد الرؤف عشرت، امیر مینائی، حسرت موہانی، مولوی محمد اسمٰعیل، سید حامد حسین رضوی، ولی احمد خان وزیر ریاست جاورہ، مولوی ظفر الرحمٰن دہلوی وغیرہ نے اردو زبان و لغت کے مختلف پہلوؤن پر کتابین لکھی ہین، جن مین سے نامون مین سے یہ صرف چند نام ہین،

اردو زبان کی علمی حیثیت علمی حیثیت سے اردو ایک ترقی یافتہ اور دولت مند زبان ہے، علم و فن کی جتنی اصطلاحین اور سنجیدہ علمی و ادبی لٹریچر کا جس قدر ذخیرہ اردو مین ہے، ہندوستان کی کسی زبان مین نہین ہے، اسکی علمی اصطلاحات دوسری صدی ہجری کے شروع ہی سے بننا شروع ہو گئی تھین، عباسیون کے ابتدائی دور مین جب یونانی، سریانی، ایرانی اور ہندی علوم کی فلسفہ، منطق، طب، ریاضی، نجوم اور ہیئت وغیرہ کی کتابون کا ترجمہ شروع ہوا، تو اس کے ساتھ ان علوم کی اصطلاحون کے ترجمے بھی عربی مین کئے گئے، اور بعض اصل زبان کی اصطلاحین بجنسہٖ عربی مین شامل کر لی گئین، چنانچہ فلسفہ و منطق خصوصاً طب مین بکثرت یونانی اصطلاحین آج تک موجود ہین، پھر جب ان علوم کو مسلمانون نے ترقی دی، اور نئے علوم پیدا کئے، تو ان کے لئے نئی اصطلاحین بھی وضع کین، مثلاً ریاضی مین الجبرا انہی کی ایجاد ہے، جس کا پورا نام الجبر والمقابلہ تھا، اب اس کا مختصر الجبرا رہ گیا ہے، اس طریقہ سے دوسرے علوم مین بھی اُن کی بہت سی وضع کردہ اصطلاحات ہین، فن عمرانیات یا علم الاجتماع کا موجد ابن خلدون ہے، جس کا مقدمہ اس موضوع پر آج بھی بنیادی کتاب شمار کیا جاتا ہے، اور علم الاجتماع کی بہت سی اصطلاحین ابن خلدون کی بنائی ہوئی ہین، جو آج بھی رائج ہین، اسی طریقہ سے حیوانات اور نباتات وغیرہ پر بھی مسلمانون نے بہت سی کتابین لکھین، اور ان سب کے لئے اصطلاحین بنائین، یہ سارے علوم ان کے ساتھ ہندوستان آئے، اور یہان کے نصاب تعلیم مین داخل ہوئے، اور صدیون ان کا رواج رہا، جس سے تعلیم یافتہ طبقہ مین ان علوم کے ساتھ ان کی اصطلاحین بھی پھیل گئین، عباسیون ہی کے زمانہ سے سنسکرت کی بعض اصطلاحین عربی مین آ گئی تھین، اس کے بعد البیرونی نے کتاب الہند مین جو ہندوستان کے عقائد و تصورات، تہذیب و معاشرت اور علوم و فنون پر بہترین کتاب ہے، بہت سی سنسکرت کی اصطلاحین استعمال کی ہین، اس کے بعد ہندوستان کے اسلامی سلاطین خصوصاً تیموریون کے زمانہ مین جب ہندوؤن کی کتابون اور اُن کے علوم و فنون کا فارسی مین ترجمہ کیا گیا، تو اس ذریعہ سے اُن کی بہت سی اصطلاحین فارسی مین آ گئین، عربی اور فارسی کے بعد جب اردو نے

اُن کی جگہ لی، تو ان دونون زبانون کی یہ ہزار سالہ میراث بھی اُس کے حصہ مین آئی، اور ایک ہزار سال سے عربی اور فارسی مین مختلف علوم و فنون کی اصطلاحون کا جو ذخیرہ جمع ہوا تھا، وہ سب اردو مین منتقل ہوگیا،

انگریزون کے دور مین جب یورپ کے نئے علوم و فنون کی تعلیم شروع ہوئی، تو فلسفہ، منطق، ریاضی اور ہیئت وغیرہ مین ان علوم و فنون کی بہت سی قدیم اصطلاحین قائم رہین، اور ان مین جو نئے اضافے ہوئے، اور سائنس، نفسیات، معاشیات وغیرہ جو نئے فنون پیدا ہوئے، اُن کی اصطلاحون کے اردو ترجمے کئے گئے، اگرچہ تعلیمی ضروریات کی بنا پر اس کا آغاز انگریزون کے ابتدائی دور ہی سے ہوگیا تھا، مگر اس کام کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے تکمیل تک پہنچایا، جس مین سارے جدید علوم کی تعلیم اردو مین ہوتی تھی، اس لئے اردو مین نئے اور پرانے تمام علوم کی اصطلاحات موجود ہین، دار الترجمہ حیدرآباد سے خاص ان اصطلاحون پر کئی کتابین شائع ہوئی ہین، بلکہ اس سے بھی بہت پہلے پرانے علوم و فنون کی اصطلاحون اور اُن کی تشریح پر مستقل کتابین لکھی گئی ہین، خود ہندوستان کے ایک فاضل مولانا محمد علی تھانوی نے اس موضوع پر کشاف اصطلاحات الفنون کے نام سے دو ضخیم جلدون مین ایک کتاب لکھی تھی، جو کلکتہ سے شائع ہوئی تھی، اب یہ کتاب نایاب ہے،

اردو کا علمی ذخیرہ

اردو علمی حیثیت سے اگرچہ ترقی یافتہ زبانون سے بہت پیچھے ہے، مگر اوسکی عمر کے لحاظ سے اس کا علمی ذخیرہ بہت وافر ہے، اور وہ مشرق کی زبانون مین ترقی یافتہ زبان کہلانے کی مستحق ہے، مگر اس مقالہ مین اسکی علمی حیثیت پر مختصر تبصرہ کی بھی گنجایش نہین ہے، اس لئے محض سرسری تذکرہ پر اکتفا کیا جاتا ہے،

(بقیہ حاشیہ ص [illegible]) [illegible] مولانا سید سلیمان ندوی نے [illegible] مین عربی کی ان اصطلاحون کی تفصیل لکھی ہے جو ہندی یا سنسکرت سے ماخوذ ہیں مثلاً ہیئت کی اصطلاح اوج ہندی کا اوچ ہے،

اردو مین نثر کی تصنیف کی ابتدا دکن سے ہوئی اور چودھوین صدی عیسوی مین اس کا آغاز ہوگیا تھا، خواجہ گیسو دراز المتوفی ۸۲۵ھ ۱۴۲۲ء کی معراج العاشقین، اور شاہ برہان الدین بیجاپوری المتوفی ۹۰۲ھ ۱۴۹۶ء کی کلمۃ الحق اور مرغوب القلوب وغیرہ اس دور کی تصنیفین ہین، مگر یہ سب دکھنی زبان مین ہین، اس کا سب سے سلیس نمونہ ملا وجہی کی سب رس ہے،

شمالی ہند مین اردو کی تصانیف کا سلسلہ اٹھارھوین صدی کے آغاز محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ سے شروع ہوا، اور فضلی اور میر محمد عطا حسین وغیرہ نے دہ مجلس اور نوطرز مرصع وغیرہ لکھین، مگر اس دور کی بیشتر تصنیفات مذہبی یا قصص اور افسانون پر مشتمل ہین، اور ان کی زبان بھی صاف اور سلیس نہین ہے،

اردو کی ترقی کی ابتدا، اٹھارھوین صدی کے وسط سے فورٹ ولیم کالج سے ہوئی، اور ڈاکٹر جان گلکرائیسٹ کی کوششون سے اُس نے صاف و سلیس زبان کی شکل اختیار کی، اور اس مین علمی و ادبی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا، اور میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، للو لال جی، نہال چند لاہوری، اور بینی پرشاد وغیرہ کی تصانیف و تراجم سے اردو مین علمی زبان بننے کی اہلیت پیدا ہوئی، انھون نے ادبی کتابون کے ساتھ سنجیدہ علمی تصنیفین، اور اُن کے ترجمے بھی کئے، اس وقت سے اردو مین علمی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا، اور چند ہی دنون مین وہ اتنی ترقی کر گئی، اور اس کا علمی و ادبی ذخیرہ اتنا وسیع ہوگیا کہ اسکی شہرت ہندوستان سے نکل کر یورپ تک پہنچ گئی، اور انیسوین صدی کے وسط مین یورپ کے فضلا نے اس کی جانب توجہ شروع کر دی، چنانچہ فرانس کے مشہور فاضل اور محسن اردو گارساں دتاسی نے اردو زبان پر اپنے مشہور خطبات دیئے، جس کا حال آگے آتا ہے،

مگر اردو کی ترقی کے لحاظ سے یہ دور بھی درمیانی تھا، اس کی اصلی ترقی کا زمانہ انیسوین صدی کے آخر سے شروع ہوتا ہے، اس کے تمام بڑے بڑے مصنفین، اور اصحاب قلم اسی زمانہ مین پیدا ہوئے، اردو زبان کے مستقل ادارے، اور اشاعت خانے قائم ہونے لگے، جنھون نے ہر علم و فن کی بلند پایہ کتابین

اور تصانیف سے اردو کا دامن بھر دیا اور سنجیدہ علمی تالیف و تصنیف کا عام مذاق پیدا ہو گیا، اور اس کی رفتار اتنی بڑھ گئی کہ نصف صدی کے اندر اردو جیسی تہی دامن زبان علمی زبان بن گئی،

جدید علوم و فنون کے تراجم اور ان کی تصانیف کا آغاز انگریزی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، اور خود لکھنؤ میں جہاں انگریزون کے قدم سب کے آخر میں پہنچے، شاہان اودھ کے زمانہ ہی سے اسکول بک سوسائٹی کے نام سے ایک علمی مجلس یا دار الترجمہ قائم ہو گیا تھا، جس نے جدید علوم و فنون کی بہت سی کتابین شائع کین، اس ترجمہ اور تصنیف کا سلسلہ انگریزی تعلیم کی توسیع و اشاعت کے ساتھ برابر بڑھتا گیا، اور دار الترجمہ حیدر آباد نے اس کو کمال تک پہنچا دیا، اور اردو مین تمام مغربی علوم و فنون منتقل ہو گئے، چنانچہ جامعہ عثمانیہ مین ان سب کی تعلیم اردو زبان مین ہوتی تھی، اور آج جدید و قدیم علوم مین مذہب و اخلاقیات اور فلسفہ و سائنسی فنون سے لے کر شعر و ادب اور افسانہ و ڈرامہ تک کوئی ایسا علم و فن نہین ہے، جس کی تصانیف یا ترجمے اردو مین موجود نہ ہون، ان سب کی تفصیل کی اس مختصر مقالہ مین گنجائش نہین ہے،

اس کا اجمالی اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فرانس کے مشہور فاضل اور محسن اردو گارسان دتاسی نے انیسوین صدی کے وسط مین اردو زبان کی تاریخ و ترقی پر خطبات دیئے تھے، جن مین اس کی ہر جہتی ترقی کا جائزہ لیا گیا تھا، اس کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آج سے ایک صدی پیشتر اردو زبان کتنی ترقی کر چکی تھی، اور اس کا علمی ذخیرہ کتنا وسیع ہو چکا تھا، اور قدیم فنون کے علاوہ جدید مغربی علوم کا بھی خاصہ ذخیرہ اس مین فراہم ہو گیا تھا، ان خطبات کا اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا ہے، جس کی ضخامت آٹھ سو صفحات سے اوپر ہے،

انڈیا آفس لندن کی مشہور لائبریری کی اردو کی مطبوعہ کتابون کی فہرست تین سو صفحات پر مشتمل ہے، جس مین بیاسی جدید و قدیم علوم و فنون کی کتابین ہین، یہ فہرست بلوم ہارٹ نے نصف ۱۹۰۰ء مین مرتب کی تھی،

اس لئے اس مین بیسوین صدی کی مطبوعہ کتابین نہین ہین، جو اردو کی ترقی کا اصلی زمانہ ہے، اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو کی جس قدر کتابین انیسوین صدی سے پہلے شائع ہوئین، اتنی تنہا اس پچاس سال کے اندر شائع ہوئی ہین، اور اسکی غیر مطبوعہ کتابون کا بھی بڑا ذخیرہ ہے، اس سے اس کے علمی ذخیرہ کا اندازہ ہو سکتا ہے،

آج سے بیس پچیس سال پہلے مرزا سجاد بیگ دہلوی نے اردو کی مطبوعہ کتابون کی ایک فہرست الفہرست کے نام سے کتابی شکل مین مرتب کر کے شائع کی تھی، افسوس ہے کہ اس مقالہ کی تحریر کے وقت وہ پیش نظر نہین تھی اسلئے اسکی کتابون کی صحیح تعداد نہین بتائی جا سکی، لیکن جہان تک خیال آتا ہے کئی ہزار تھی، اور اس کی ضخامت ایک ہزار صفحون سے اوپر تھی، اور اس پچیس سال کے عرصہ مین یہ تعداد اور زیادہ بڑھ گئی ہو گی،[1]

میرے محترم استاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ مین ایک کتب خانہ عرصہ سے قائم ہے، جس مین اردو کی تمام مطبوعات کے جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اس کی کتابون کی تعداد اب سے کئی سال پہلے دس ہزار کے قریب تھی، آپ کے اس شہر لکھنؤ کے صرف ایک مطبع نولکشور نے اردو کی اتنی کتابین شائع کی ہین، جن سے اردو کا پورا کتب خانہ قائم ہو سکتا ہے،

---

[1] الفہرست یون بھی اردو کی تمام مطبوعات پر حاوی نہین تھی، اس مین بہت سی کتابون کے نام نہین تھے، اور اب تو اس کی ترتیب و اشاعت پر بھی پچیس سال گذر چکے ہین، اور اس مدت مین سیکڑون کیا ہزارون نئی کتابین شائع ہو چکی ہین، اس لئے اردو مطبوعات کی ایک جامع اور مکمل فہرست کی بڑی ضرورت ہے، جس سے اس کے علمی و ادبی ذخیرے کا اندازہ ہو سکے، یہ کام کچھ زیادہ دشوار نہین ہے، ہندوستان کے کتب خانون کی فہرستون کی مدد سے آسانی کے ساتھ یہ فہرست تیار ہو سکتی ہے، خصوصاً حیدر آباد کے اردو کے کئی کتب خانون کی فہرستین شائع ہو چکی ہین، انڈیا آفس، اور برٹش میوزیم کے کتب خانون کی فہرستون سے بھی اس مین بڑی مدد مل سکتی ہے،

ہندوستان خصوصاً یوپی، بہار، پنجاب کے تمام بڑے بڑے شہرون بالخصوص دلی، لکھنؤ، لاہور اور حیدرآباد مین اردو کے بکثرت پریس، دارالاشاعت اور مکتبے قائم تھے، اور آج بھی موجود ہین، جنھون نے اردو کی ہزارون کتابین شائع کین، ان کے علاوہ اردو کی ترقی و اشاعت کے بہت سے ادارے قائم ہوئے، ان مین دارالمصنفین، انجمن ترقی اردو، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اور ندوۃ المصنفین زیادہ اہم ہین جنھون نے اپنی تصنیفات و تراجم سے اردو کا تصنیفی معیار بلند اور اس کا دامن سنجیدہ علمی تصانیف سے مالا مال کر دیا، اور آج اردو زبان بھی ایک علمی زبان کہلانے کی مستحق ہو گئی، اس سے اردو زبان کے علمی ذخیرہ کا سرسری اندازہ ہو سکتا ہے، ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

دوسری زبانون مین اردو کتابون کے ترجمے

اردو زبان کی علمی اہمیت اور اس کے علمی ذخیرہ کی گرانمایگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مشرق و مغرب کی مختلف زبانون مین اس کی متعدد اہم کتابون کا ترجمہ ہو چکا ہے، یون تو مشرق کی قدیم اقوام و مذاہب اور ان کی تاریخ و تمدن کی تحقیقات کے سلسلہ مین بہت سی قدیم مشرقی زبانون کی کتابون کا جن مین کوئی اہم علمی ذخیرہ یا کلاسکل لٹریچر موجود ہے، مستشرقین نے ترجمہ کیا ہے، اس قسم کی ہندوستان کی قدیم کتابون کا ترجمہ بھی مختلف زبانون مین ہو چکا ہے، لیکن اردو جیسی کسی نومولود زبان کی کتابون کا جس کی عمر چند صدیون سے زیادہ نہ ہو، اور وہ کوئی قدیم علمی ذخیرہ بھی نہ رکھتی ہو، اردو کے علاوہ ترجمہ نہین کیا گیا، اور یہ فخر و امتیاز صرف اردو کو حاصل ہے کہ اس کی متعدد کتابون کا ترجمہ ان کی علمی اہمیت کی بنا پر دوسری ترقی یافتہ زبانون مین کیا گیا،

ان ترجمون کی بھی دو حیثیتین ہین، ایک تو ان کتابون کے ترجمے ہین، جن کی کوئی علمی اہمیت نہین ہے، بلکہ مترجمین نے اردو زبان سے اپنی ذاتی دلچسپی یا اس کے لٹریچر کو اپنی زبان مین روشناس

کرنے یا اپنی قوم کی اردو کی تعلیم کے لئے کئے ہین، مثلاً اردو کے مشہور محسن گارسان دتاسی نے میر کی مثنوی اژدر نامہ، تحسین الدین کی کام روپ، مسکین کے مرثیون، نہال چند لاہوری کی تاج الملوک اور بکاؤلی اور میر امن کی باغ و بہار کا فرنچ زبان مین ترجمہ کیا، کلیات ولی مرتب کر کے شائع کیا، اردو انگریزی فرنچ لغت مرتب کی، فرنچ مین اردو زبان کی تاریخ اور اس کے مصنفین اور تصانیف پر ایک کتاب لکھی، اس قسم کی اردو کی اور بھی خدمات انجام دین، یا اردو زبان کے دوسرے انگریز محسن ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے مختلف حیثیتون سے اردو زبان کی خدمت کی، اس کے مختلف پہلوؤن پر انگریزی مین کتابین لکھین، انگریزون کی اردو تعلیم کے لئے متعدد کتابین تالیف کین، اور اردو کی بعض کتابون کا ترجمہ کرایا، تعلیمی سلسلہ مین میر امن کی باغ و بہار اور ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس کا انگریزی مین ترجمہ کیا گیا، مگر یہ تراجم بیشتر تعلیمی ضرورت یا مترجمین کی اردو سے دلچسپی کی بنا پر کئے گئے، ایسے ترجمے ہندوستان کی بعض دوسری زبانون کی کتابون کے بھی ہوئے ہین، اور ہمارا مقصود یہ ہے کہ اردو کی کتابون کا ترجمہ ان کی علمی اہمیت اور علمی استفادہ کے لئے کیا گیا، مثلاً سر سید کی آثار الصنادید کا انگریزی اور فرنچ مین ترجمہ ہوا، فرنچ کے مترجم گارسان دتاسی ہین، اردو کتابون مین یہ فخر سب سے زیادہ مولانا شبلی مرحوم اور دارالمصنفین کی کتابون کو حاصل ہے، چنانچہ شعر العجم کا فارسی ترجمہ افغانستان کے ایک مشہور ادیب و شاعر سرور خان گویا نے کیا جو حکومت افغانستان کی جانب سے شائع ہو چکا ہے، اور نامور مستشرق مسٹر براؤن نے اپنی مشہور کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا مین اس سے فائدہ اٹھایا، جس کا اعتراف اس کتاب مین کیا ہے، بلکہ اس کا آخری حصہ جو ۱۵۰۰ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک کے شعراء کے حالات پر مشتمل ہے، اس مین تیموری دور کے تمام شعراء کے حالات بیشتر شعر العجم سے ماخوذ ہین، جن کے حوالے حواشی مین موجود ہین، سیرۃ النبی حصہ اول، دوم اور سوم اور الفاروق کا ترجمہ ترکی زبان اور ہندوستان کی بعض زبانون مین کیا گیا، یہ تمام ترجمے دارالمصنفین کے کتب خانہ مین موجود ہین، عرصہ ہوا مصر کے بعض فضلا نے اس کے عربی ترجمہ کی اجازت مانگی تھی، جو دی گئی تھی، مگر اس کے بعد پھر کوئی

اطلاع نہین ملی، مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کی کتاب خیام کا ترجمہ بھی ایران مین ہونے والا تھا، مگر اُس کے متعلق بھی اب تک کوئی علم نہین ہوسکا، مولانا محمد حسین آزاد کی سخندان فارس کا ترجمہ ایران مین کیا گیا، نواب امداد امام اثر کی ایک کتاب کا جو فن باغبانی پر ہے، ڈچ زبان مین ترجمہ ہوا، اس کے علاوہ انگریزون کی اردو تعلیم کے سلسلہ مین اس کی متعدد ادبی کتابون کے ترجمے کئے گئے، مگران سب کا استقصار مقصود نہین ہے، سرسری یادداشت سے جو نام یاد آئے، وہ لکھدیئے گئے، اگر تلاش سے کام کیا جائے، تو اور بھی بہت سی کتابون کے نام مل جائین گے، اس سے اردو کے علمی ذخیرہ کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے،

اردو کی شاعری

یہ تو اردو کے نثر کی ذخیرہ کا حال ہے، اُس کی نظم کا ذخیرہ بھی کم نہین ہے، اور اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اردو مین نظم کا آغاز نثری تصانیف سے بھی پہلے ہوا اور اب تک اوس کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری ہے، اور اس مین شاعری کی ہر صنف کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، شاعری سے اردو زبان کو بڑا فائدہ پہنچا، اسی نے اس کو تراش خراش کر سنوارا، اور اس کو حسنِ بیان اور تیغ زبان کے جوہر عطا کئے، مثنویون اور مرثیون نے موضوعِ شاعری مین وسعت پیدا کی، اور اس کو جذبات نگاری، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کی قوت بخشی، غزل شاعری کی سب سے محدود اور تنگ صنف ہے، اور اس مین بہت سی خامیان بھی ہین، مگر اس سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ اسی نے اردو کو سلیس و فصیح بنایا، اور اس خصوصیت مین تو اس کا کوئی شریک و سہیم نہین کہ مختصر حکیمانہ اور اخلاقی خیالات کے اظہار کے لئے سب سے زیادہ موزون غزل ہی کے فرد اشعار ہین، جو اس کو ضرب المثل بنادیتے ہین، اور کبھی کبھی ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک مصرعہ ایک جہانِ معنی کا کام دے جاتا ہے،

تاہم اس سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ اردو شاعری خامیون سے پاک نہین ہے، خصوصًا موجودہ اصطلاح مین وہ زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضون سے خالی ہے، مگر یہ اس ماحول کا قدرتی نتیجہ ہے،

جس مین وہ پروان چڑھی، محمد شاہ رنگیلے، اور جانِ عالم پیا کی رنگینیون مین خونِ جگر کی آمیزش کہان سے ہوسکتی تھی، اور بہادر شاہ کی زنگ خوردہ تلوار مین تیمور اور بابر کی تلوار کے جوہر کہان سے پیدا ہوسکتے تھے، اس زمانہ مین جب کہ پوری سوسائٹی مست و مدہوش تھی، زندگی کے سنجیدہ مسائل کا ہوش کس کو تھا، اسلئے اسی زندگی کا عکس اردو شاعری مین بھی آیا، تاہم یہ شاعری بھی محض دفتر بے معنی نہین ہے، اور اس مین ہماری بہت سی پرانی قدرین اور ہماری تہذیب کے پرانے نقش و نگار محفوظ ہین،

مگر شاعری بھی ماحول کا آئینہ ہوتی ہے، اس لئے جب ہوا کا رُخ بدلا، حکومت کی بساط الٹی، اور مغربی تہذیب اور مغربی علوم و افکار نے ہندوستانیون کے خیالات پر اثر ڈالا، تو اردو شاعری کا رنگ بھی بدلا، اور سب سے پہلے غالب نے غزل کی تنگ دامانی مین وسعت پیدا کی، محمد حسین آزاد نے نیا راگ چھیڑا، حالی، شبلی اور اکبر نے شاعری سے قومی اصلاح اور پس ماندہ کاروانِ ملت کے لئے حُدی کا کام لیا، اور اقبال نے اوس کو کارزار حیات کا صور اور میدان جنگ کی تکبیر بنا دیا، اُن کی شاعری مین حکیمانہ خیالات کا ایک عالم ہے، قومون کی موت و حیات ترقی و تنزل، اور تعمیر و ترقی کا وہ کونسا اصول اور فلسفہ ہے جو اس مین نہین ہے، اور اب اردو شاعری موجودہ دور کے تقاضون کو بھی قبول کر رہی ہے جس کا نمونہ ترقی پسند شاعری ہے، اور اردو نظم مین قومی و ملی شاعری کا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے،

جس شاعری کا دامن میر و غالب، انیس و دبیر، اکبر و حالی اور اقبال کے کلام سے معمور ہو، وہ بے تکلف ہر زبان کی شاعری کے سامنے فخریہ اپنا سر بلند کرسکتی ہے، اس لئے شاعری کے میدان مین بھی اردو کسی سے پیچھے نہین ہے، تاہم ابھی اس کے بعض پہلو اصلاح طلب ہین جن کی اصلاح خود زمانہ کرتا جارہا ہے، اور وہ دیر سویر ہو کر رہے گی،

(باقی)

اقبال اور وائٹ ہیڈ[1]

از

ڈاکٹر عشرت حسن انور ایم اے پی ایچ ڈی لکچرار شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی،

(۷)

پچھلے مضمون[2] میں ہم یہ کہہ آئے ہیں کہ اقبال ولیم جیمس کی طرح کائنات کو ذات باری سے جس قدر ممکن ہے قریب سے قریب تر تصور کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ذات باری اور افراد عالم کے درمیان دوری مہجوری اور تمام و کمال اجنبیت اور غیریت کو کسی طرح تسلیم نہیں کیا جاسکتا،

ما توا جوئیم تو از دیدہ دور
نے غلط ما کور تو اندر حضور

ذات حق را نیست این عالم حجاب
غوط را حائل نگردد نقش آب

گرچہ اندر خلوت و جلوت خداست
خلوت آغاز است جلوت انتہاست

زیر گردون خویش را یابم غریب
زانسوے گردون بگوانی قریب

۱؎ وائٹ ہیڈ (Whitehead) ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوا، اس کا فلسفہ بہت دقیق ہے، اس کو اگرچہ محسوس کیا جاسکتا ہے، لیکن بعض اصحاب کے خیال میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اسی لیے اس کے بیان کرنے میں اختلافات کی بڑی گنجائش باقی رہتی ہے، وائٹ ہیڈ کو سمجھنے کے لئے ایک لامتناہی پرواز خیال اور غیر معمولی انقلاب فکر و نظر کی ضرورت ہے، اور چونکہ خود وائٹ ہیڈ کے خیالات بھی مختلف ادوار سے گذرے ہیں، اس لئے اس کے فلسفہ کو متعین کرنا اور بھی مشکل ہوگیا ہے ۲؎ اقبال اور ولیم جیمس، معارف بابت نومبر و دسمبر ۵۰ء

تو اے اسیر جہان لامکان سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکدان سے دور نہیں

ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

ہوئی جو چشم مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

اور ایسی ذات جو ہم سے قطعی غیریت اور اجنبیت کا تعلق رکھتی ہو، کسی طرح بھی خداوند عالم کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی،

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقۃً ہم اجنبی اسی کو کہتے ہیں، جس کا وجود ہماری زندگی اور ہمارے مقصد حیات میں کوئی گنجائش ہی نہ رکھتا ہو، جس قدر کوئی فرد ہماری ذات اور ہمارے مقاصد حیات کے حصول سے غیر متعلق ہوگا، اسی قدر ہمارے لئے اجنبی اور غیر ہوگا، اشیار کا بھی یہی حال ہے، اگر بعض اشیار ہمارے عملی رجحانات میں کسی طرح معاون یا ہماری زندگی سے کسی طرح بھی متعلق نہیں ہیں، تو وہ ہم سے قطعی غیر متعلق ہونے کی وجہ سے نہ صرف ہمارے لئے اجنبی اور غیر تصوری ہو جائیں گی، بلکہ ہمارے لئے ان کے وجود کا اقرار کرنا بھی بہت حد تک ناممکن ہے، بقول اقبال:۔

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بوقلمونی
وہ چاند یہ تارا ہے وہ پتھر یہ نگیں ہے

دیتی ہے مری چشم بصیرت بھی یہ فتویٰ
وہ کوہ یہ دریا ہے وہ گردوں یہ زمیں ہے

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

اس مخصوص خیال کو عدم کے مفہوم پر غور کرنے سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے، ہم جس کو عدم کہتے ہیں، آخر اس کی کیا حقیقت ہے؟ عدم کے معنی اگر غور سے دیکھا جائے تو عدم وجود کے نہیں ہیں، اگر عدم کو عدم وجود کے مترادف سمجھا جائے، تو پھر عدم قطعی سے کائنات کا وجود ہونا قطعی سمجھ میں نہیں آسکتا،

چنانچہ عدم خود ایسی مخصوص حالت وجود ہے، جب ذوقِ زندگی مین ذوقِ طلب نمایان نہو سکا تھا یعنی جب وہ انسان جو ذوق و شوقِ طلب سے سرشار ہے، منصۂ شہود پر جلوہ گر نہین ہوا تھا، یہ حالتِ وجود حالتِ عدم کے مترادف کہی جاسکتی ہے اور یہ وہ حالت ہے جب ہمارے ذوق و شوقِ طلب اور جستجو اور مقاصد کا آغاز نہ ہوا تھا طلب و جستجو اور مقاصد کے پیدا ہو جانے کے بعد ہی کائنات مین رنگینی اور دلآویزی پیدا ہو سکی ہے، ورنہ مقاصدِ زندگی وجود انسانی شخصیت مین بدرجۂ اتم جلوہ گر ہین) کے بغیر تمام وجود عدم کے مترادف تصور کیا جاسکتا ہے[۵۰] ہان مقاصدِ زندگی پر غور و فکر کرنے کی بڑی ضرورت ہے، مقاصدِ زندگی اگرچہ آج ہماری آپ کی زندگی سے منسوب کئے جاسکتے ہین، اور بہت حد تک وہ ہمارے آپکے تجویز کردہ ہین بھی، لیکن درحقیقت ہم اور آپ خود ذوقِ زندگی کے تجویز کردہ تعینات ہین جو اُس نے اپنے فروغ اور اپنی بالیدگی کے لئے تجویز کر لئے ہین، پھر اسی طرح جو کچھ ہم اور آپ اپنے لئے متعین اور مقرر کرتے ہین، وہ خود زندگی کے فروغ اور ارتقا کا موجب ہوتا ہے، ہمارا ہر ایک تمام فکر و عمل اسی فروغِ حیات کے مقصد کی طرف مرکوز ہے، ہمارے تمام مذہبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، تاریخی، علمی، فنی، ادبی، تہذیبی، تمدنی، فلسفیانہ، اور حکیمانہ نظریات و خیالات، بلکہ خود ہمارے تصورات زندگی کو فروغ دینے کے لئے ایجاد اور ان حقائق کو موجود کرنے کی غرض سے تعمیر کئے جاتے ہین، جو ہمارے شوقِ طلب اور ذوقِ ایجاد سے پہلے ہماری بے التفاتی

---

[۵۰] یہ تجویز برکلے (Berkeley) کے خیالات سے قطعی مختلف ہے، برکلے کا خیال تھا کہ اشیاء کا وجود مشاہدہ پر منحصر ہے، اس کے نزدیک وجود کے معنی ہی شہود ہین، اگر کسی شے کے وجود کی کوئی شہادت دینے والا نہوگا، تو گویا وہ شے بھی موجود نہ ہوگی، اقبال اگرچہ بعض اشعار مین برکلے سے متاثر معلوم ہوتے ہین، لیکن بہ نسبت برکلے کے برگسان اور ولیم جیمس سے زیادہ متاثر ہونے کی وجہ سے اشیاء کے وجود کو وہ انسانی مقاصد اور طلب کے ماتحت قرار دیتے ہین، انکے خیال مین کائنات عالم ہمارے ذوقِ طلب کی پابند معلوم ہوتی ہے، ذوقِ طلب برکلے کے مشاہدہ کا ہم پلہ ہے لیکن اس کے مترادف نہیں،

اور بے توجہی کے باعث خلعتِ وجود سے عاری تھے،

اب تک ہم یہ معلوم کر چکے ہین کہ جو شے ہمارے مقاصدِ حیات کے حصول مین ہمارے لئے جس قدر اہم اور ضروری ہے، اسی اہمیت کی نسبت سے وہ ہمارے لئے موجود ہے، اور اسی قدر حقیقی کہلائے جانے کی مستحق ہے، اب اگر تمام افرادِ عالم اجتماعی اور انفرادی طور پر اپنے مقاصدِ حیات اور تکمیلِ ذات کے لئے کسی ایسی ذات کے اقرار اور اعتراف پر مجبور ہون جس کے بغیر اُن کے مقاصدِ حیات یا مقصدِ حیات کا حصول ہی نہو سکتا ہو تو ایسی ذات تمام مقاصد کا مرجع اور مرکز ہونے کی بنا پر مراتبِ وجود مین سب سے زیادہ حقیقی اور واجب الوجود اور قائم بالذات شمار کی جائے گی، یہی ذات تمام کائنات کا مرکز قرار پائیگی، اور تمام انفرادی یا اجتماعی طلب و جستجو اور تکمیلِ ذات کی تگ و دو اس سے منسوب کئے بغیر تشنۂ تکمیل اور ناقص تصور کی جائے گی، اگر کائنات کو دائرہ کہا جائے تو ایسی ذات کو اس دائرہ کا مرکز تسلیم کرنا ہوگا، اس مرکز کو اگر تھوڑی دیر کے لئے غیر مرئی تصور کر لیا جائے، تو اس غیر مرئی نقطہ اور باری تعالیٰ کے وجود مین ایک گونہ گہری مماثلت اور مشابہت پیدا ہو جاتی ہے، جس طرح دائرہ بغیر کسی مرکز کے معرضِ وجود مین نہین آسکتا، اسی طرح کائنات بغیر باری تعالیٰ کے وجود کے ظہور پذیر نہین ہو سکتی، اور جس طرح دائرہ کو مرکز سے ایک مخصوص نسبت حاصل ہے، اسی طرح کائنات کو باری تعالیٰ سے ایک مخصوص قسم کا تعلق ہے، جس طرح کوئی دائرہ مرکز کے بغیر تصور نہین کیا جا سکتا، اسی طرح کائنات بھی بغیر ایک مرکز کے (یہ مرکز غیر مرئی سہی) تصور نہین کی جا سکتی،

اکثر اصحاب نے جیسا کہ ہم پچھلے مضمون مین کہہ آئے ہین[۵۱] اس مرکزِ وجود (یعنی باری تعالیٰ) کو کائنات سے قطعی علٰحدہ، غیر متعلق اور غیر مربوط تصور کیا ہے، مثلاً تمام وہ اصحاب جو الہیت[۵۲] کے قائل ہین

---

[۵۱] اقبال اور ولیم جیمس، معارف بابت ماہ نومبر ۵۱ء

[۵۲] ہم اس کو صمدیت کے لفظ سے تعبیر کرین گے،

باری تعالیٰ کے وجود کو کائنات قطعی ماورا تصور کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ذاتِ باری کائنات سے مطلقاً وراء وراء الوراء ثم وراء الوراء[۱] ہے، اگر اس خیال کے آخری نتائج پر غور کیا جائے، تو نہ صرف خالق و مخلوق کے درمیان قطعی غیریت تمام و کمال اجنبیت، دوری و مہجوری اور بے ربطی و بے تعلقی کا اقرار لازم آتا ہے، بلکہ ہم یہ کہنے پر بھی مجبور ہوتے ہیں کہ خالق و مخلوق کے درمیان انتہائی غیریت اور اجنبیت کی بنا پر ذاتِ خداوندی کے اوصاف مخلوقات کے فطری رجحانات کی تائید و پرورش اور فروغ کے کسی طرح ضامن نہیں ہو سکتے، اسی طرح یہ کہنا بھی لازمی ہو جاتا ہے کہ ایسی صورت میں انسانی فطرت میں صفاتِ خداوندی اور قربِ الٰہی کی کوئی گنجائش نہیں باقی نہیں رہتی، اس لئے وہ ان تمام حقائق سے عاری ہے، جن کو عرفِ عام میں ملکوتی صفات اور خداوندی ملکات کے جامع ترین الفاظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے،

یہ نتائج جیسا کہ ہم پچھلے مضمون میں کہہ آئے ہیں انسان کی شخصیت اس کی اعلیٰ ترین فطرت، اور اس کے شوقِ رفعت کے لئے بہت دل شکن اور خطرناک ہیں، انسان بحیثیت انسان کے ان خطرناک نتائج کا متحمل نہیں ہو سکتا، کائنات اس قدر بے ذوق، دل شکن اور ہمت فرسا نہیں ہے، جس قدر کہ خدا کے وجود کو کائنات سے غیر متعلق کر دینے کے بعد محسوس ہوتی ہے،

اس لئے انسان کی اعلیٰ ترین فطرت کی تائید کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو اعلیٰ ترین حقائق سے متعلق تصور کیا جائے[۲]، یعنی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان کا باری تعالیٰ سے اس قدر قریبی تعلق ہے کہ گویا وجودِ باری اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے[۳]، اس کے لئے ضروری ہے کہ بجائے صمدیت[۴] کے

۱؎ یہ الفاظ حضرت مجدد صاحب رحمۃ سے ماخوذ ہیں ۲؎ بائرن کا یہ کہنا کہ "اگر عرش پر خدا ہے تو فرش پر سب طرح کا اطمینان ہے"، انسانی رجحانات کے تحت دلیل قاطع نہیں، کامیاب زندگی کے لئے خدا کا صرف عرش پر ہونا کافی نہیں، فرش پر بھی کسی نہ کسی حیثیت سے اس کا وجود ضروری ہے ۳؎ نحن اقرب الیہ من حبل الورید ۴؎ Theism کو الٰہیات میں اس کو الٰہیات کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، اگر ہمارے

وحدت الوجود کا اقرار کیا جائے، اقبال کے فلسفہ کی تعبیر میں یہ نکتہ جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں[۱] ولیم جیمس سے ماخوذ ہے،

وحدتِ وجود کے اقرار سے ایک دشواری البتہ پیدا ہوتی ہے، اور تاریخ فلسفہ میں یہ دشواری مختلف مقامات پر رونما ہوئی ہے، وہ یہ کہ وحدتِ وجود کے اقرار سے کثرتِ وجود غیر حقیقی اور محض اعتباری قرار پاتا ہے، اس لئے وحدتِ وجود کے اقرار کے ساتھ ساتھ کثرتِ وجود کے اقرار کی کیا سبیل ہو سکتی ہے؟

اقبال اس سوال کو حل کرنے میں قدیم صوفیائے اسلام کے بجائے جدید ترین مغربی حکما، بالخصوص وائٹ ہیڈ کے بعض نظریات سے متاثر ہیں، اور یہ مخصوص نظریات اُن کے خاص فلسفہ کی تعبیر میں کسی قدر ترمیم و اضافہ کے ساتھ معاون نظر آتے ہیں،

قدیم صوفیائے اسلام کے نزدیک، جیسا کہ پچھلے مضمون میں عرض کیا جا چکا ہے، اعیانِ ثابتہ کے ذریعہ اس مشکل کو حل کیا جا سکتا ہے[۲]، ان کا کہنا ہے کہ کثرتِ وجود باری تعالیٰ کے صورِ علمیہ ہیں، صورِ علمیہ ہونے کی حیثیت سے یہ کثرت اگرچہ اپنی جگہ حقیقی اور معنوی وجود کی حامل ہے، لیکن پھر بھی اصل حقیقت ایک ہی ذات ہے، اور وہ باری تعالیٰ کا وجود ہے، کثرتِ وجود باری تعالیٰ کے صورِ علمیہ ہونے کی حیثیت اور ایک طرح حقیقی وجود کے حامل ہونے کی وجہ سے موجود کہے جا سکتے ہیں لیکن چونکہ اُن کا وجود تمام و کمال طور پر ذاتِ خداوندی ہی کا تجویز کردہ ہے، اور اسی کے تصورِ علمیہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے بذاتِ خود کوئی حقیقت نہ رکھنے کی بنا پر ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے،

۱؎ اقبال اور ولیم جیمس معارف بابت نومبر ۱۹۵۱ء ۲؎ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ اقبال بھی صوفیاء کے اس خیال کے مرہونِ منت ہیں، مثلاً محترم ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اپنی گرانقدر تصنیف "رموزِ اقبال" (ص ۱۰۰-۱۰۶) میں اسی خیال کی تائید فرمائی، ہم پچھلے مضمون میں اس خیال سے اختلاف ظاہر کر چکے ہیں، اس مقالہ میں اپنی رائے کی مزید تائید میں بحث کریں گے،

بعض صوفیائے کرام مثلاً مولانا جامیؒ کا یہ طرزِ فکر اگرچہ بڑی حد تک وحدت اور کثرت کی گتھی کو سلجھانے کا مدعی ہے، اور کسی حد تک ذاتِ باری کی وحدت کے ساتھ ساتھ کثرتِ وجود کو بھی برقرار رکھنے کا ایک کامیاب طریقہ معلوم ہوتا ہے، پھر بھی اقبال کے فلسفہ کی رو سے مندرجۂ ذیل اعتراضات کی بنا پر قابلِ قبول نہیں ہے،[1]

۱۔ اگر کثرتِ وجود باری تعالیٰ کے صورِ علیہ کی حیثیت رکھتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا وجود اسی قدر اعتباری اور غیر حقیقی ہے، جس قدر کہ ذاتی وحدت الوجود کے حامیوں نے پیش کیا ہے، جو افراد کو فی نفسہٖ وجودِ ذاتی (یعنی خودی) کا حامل قرار نہیں دیتے، اور یہی بات صورِ علیہ کے طرفداروں کے بیان سے بھی ظاہر ہوتی ہے،

۲۔ کثرتِ افراد کا وجود باری تعالیٰ کے صورِ علیہ ہونے کی حیثیت سے اپنے وجودِ ذاتی (یعنی خودی) کا اقرار کرنے سے قاصر ہے، اور اگر ایسا ہے (اور صورِ علیہ کا بوجہ محض صور علیہ ہونے کے ایسا ہونا لازم ہے) تو اقبال کے نزدیک ان کا عدم وجود برابر ہے،

گفت موجود آنکہ می خواہد نمود — آشکارائی تقاضائے وجود

زندگی خود را بخویش آراستن — بر وجودِ خود شہادت خواستن (جاوید نامہ)

۳۔ اگر بفرض یہ تصور کر لیا جائے (اور محترم ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے بھی تجویز پیش کی ہے[2]) کہ جب باری تعالیٰ نے ان صورِ علیہ کو خارج میں وجودِ ذاتی یعنی خودی سے بھی متصف فرما دیا ہے، تو پھر افرادِ عالم اس قسم کے وجود کے باوجود صحیح معنی میں وجودِ ذاتی کے حامل نہیں قرار دیئے جا سکتے، وجودِ ذاتی[3]

---

[1] یہاں ہم انھیں اعتراضات پر قانع رہیں گے، جو اقبال کے فلسفہ سے مستنبط کئے جا سکتے ہیں،

[2] رموزِ اقبال صفحہ ۳۰،

[3] یعنی خودی،

اقبال کے نزدیک کسی اور ذات کا محتاج نہیں ہو سکتا، خودی کسی غیر خود کی محکوم اور محتاج نہیں ہے، اگر محکوم یا محتاج ہے، تو وہ خودی نہیں، فریبِ خودی ہے، بقولِ اقبال کے ع :-

وجود کیا ہے، فقط جوہرِ خودی کی نمود

اور یہ خودی اپنی ہی ذات سے متعلق ہے کسی غیر کی محتاج نہیں ؎

از من برون نیست منزلِ گہِ من — من بے نصیبم راہے نیافتم (زبور عجم)

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو — منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو "

۴۔ اگر افرادِ عالم کو صورِ علیہ الٰہی تصور کیا جائے، تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان کے تمام افعال، احساسات، اور خیالات کو بھی صورِ علیہ الٰہی تصور کیا جائے یا نہیں، اس کا جواب اگر اثبات میں ہے، تو افرادِ عالم کے تمام افعال محدود اور پابند ثابت ہوتے ہیں، اور ہم سب کی خود مختاری سخت مجروح ہوتی ہے، اور اگر اس سوال کا جواب نفی میں دیا جائے، تو خود باری تعالیٰ کی ذات محدود اور غیر مطلق ثابت ہوتی ہے، ہمارے انکار کا مطلب یہ ہوگا کہ ذاتِ باری ہمارے افعال پر محیط نہیں ہے، اور وہ اس کے تصورِ علمی سے خارج ہیں، اس طرح اس کا مطلق تصور کرنا ناممکن معلوم ہوگا،

۵۔ افرادِ عالم صورِ علیہ الٰہی ہونے کی وجہ سے یہی نہیں کہ اپنے اپنے افعال میں پابند تصور کئے جائیں گے، بلکہ اپنے مقاصد کی تعمیر میں خاص طور سے عاجز خیال کئے جائیں گے، جب اُن کی ذات تصورِ علیہ الٰہی کی حیثیت رکھتی ہے، تو ظاہر ہے کہ جو مقصدِ حیات یا مقاصد اُن کی ذات سے منسوب کئے جاتے ہیں، وہ بھی ذاتِ باری کے تصورِ علمیہ میں پہلے سے موجود تصور کئے جائیں گے، اس طرح ان کے وجود کو آزادی اور خود مختاری سے یکسر عاری ماننا پڑے گا،

۶۔ اگر افرادِ عالم صورِ علیہ الٰہی ہیں، تو جو تصورات اُن کی ذوات سے مخصوص ہیں، مراتبِ وجود میں ان کی آخر کیا حیثیت ہے؟ اگر اُن کی ذوات "تصوراتِ الٰہی" کے مترادف ہیں تو اُن کے تمام تصورات کو

تصور تصورات کہنا موزون ہوگا، اگرچہ اس طرح ان کی بے حقیقتی اور کم مایگی اور بھی زیادہ نمایان نظر آئیگی، لیکن ہمارے آپ کے سب کے تصورات مخصوص حقائق سے متعلق ہین، اور انہی حقائق کے تحت وہ معرضِ وجود مین آئے ہین، اب اگر ان تصورات کو تصور تصورات کہا جائے گا، تو پھر ان حقائق کو جن کے تصورات قائم کئے گئے ہین، کیا تصور فی التصور تصورات کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا، اس طرح تمام کائنات ایک مخصوص تصور تصور تصورات کے ہم معنی تصور کی جائے گی، اور اسکی بے ثباتی بے اصلی اور بے حقیقتی ایک گنی کی جگہ تین گنی نمایان نظر آئے گی، ان مفروضات مین فلسفۂ خودی (جس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ذات افراد حقیقی ہے) کے لئے کوئی گنجایش ہی باقی نہین رہتی،

۷- اس "اعیان ثابتہ" کے مفروضہ مین افلاطونی نظامِ فکر[۵۱] کی جھلک نظر آتی ہے، اور اقبال اس نظامِ فکر کو جس کا دار و مدار ہی تصورات پر ہے، حیاتِ انسانی کے قطعی منافی خیال کرتے ہین، مثلاً

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت[۵۲]
قوما از سکر او مسموم گشت — خفت از ذوقِ عمل محروم گشت

۸- اقبال جیسا کہ ہم اس سلسلہ کے سب سے پہلے مضمون مین کہہ آئے ہین برگسان سے بعید

---

[۵۱] جس کی بنیاد ہی تصورات پر ہے [۵۲] ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال کے فلسفۂ الٰہیات مین اعیان ثابتہ کی کوئی گنجایش نہین ہے، اور ایک جگہ کہتے ہین،

تڑپ رہا ہے فلاطون میانِ غیب و حضور — ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف

ایک دوسری جگہ کہتے ہین،

بکیمیاگرِ عقل جہان مین فلاطون نکنم — در کنارم دلکے شوخ و نظر بازی ہست
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اسکی — یہ زندگی ہے نہین ہے طلسمِ افلاطون

متاثر ہین، اور اس کی رہنمائی مین وہ وجدان کے مقابلہ مین عقل کو جو تمام تصورات کی ضامن ہے ایک سٹر دکر دیتے ہین، وہ اس خیال مین برگسان سے متفق ہین کہ ہمارے تصورات زندگی کے بہاؤ کے کسی ایک لمحہ کے فوٹو ہین لیکن زندگی فی نفسہ کیا ہے، یہ صرف وجدان ہی سے محسوس کیا جا سکتا ہے، اس کو تصورات کے ذریعہ کسی طرح نہین سمجھا جا سکتا، تصورات زندگی کے بہاؤ کا کسی طرح احاطہ نہین کر سکتے، ہمارے آپ کے تمام تصورات کا کل مجموعہ بھی اس حقیقتِ نفس کو جس کو ہم اور آپ درون سینہ وجدان کے ذریعہ محسوس کر سکتے ہین کسی طرح بھی محصور نہین کر سکتا، تصورات درحقیقت جامد، ساکت، ثابت اور غیر متحرک حالتون کی تصاویر ہین، اور زندگی ایک سلسلۂ حرکت ہے، اور اس سلسلۂ حرکت و حیات کو جس مین کہین بھی سکون و جمود کی گنجایش نہین ہے، لاکھون بلکہ لاتعداد تصورات بھی من و عن پیش کرنے سے قاصر ہین، اور ہمیشہ رہینگے

اسی طرح ہم اپنے ہی وجدانِ ذات کو اپنے تصورات مین پیش کرنے سے قاصر ہین لیکن اپنے علاوہ دوسرون کے وجدانِ ذات کو ہر ایک شخص تصورات کے سانچہ مین ڈھالنے سے بالکل مجبور ہے، وجود ذات کیا ہے، اس کو ہر شخص اپنی اپنی جگہ خود ہی وجدان کے ذریعہ محسوس کر سکتا ہے، کوئی دوسرا شخص اس کو کسی طرح اشارۃً کنایۃً بھی پیش نہین کر سکتا، انتہا یہ ہے کہ خود ذاتِ باری بھی جو تمام حیات کا مرجع ہے، ہمارے آپکے ذوق و شوقِ زندگی اور سوزِ حیات کا ادراک کرنے سے قاصر ہے

صنوبر بندۂ آزادۂ او — فروغِ روے گل از بادۂ او
خرَیش آفتاب و ماہ و انجم — دلِ آدم در کشادۂ او (پیامِ مشرق)

ایسی حالت مین افرادِ عالم کو صورِ علمیہ الٰہی تصور کرنا کسی طرح درست نہین،

۹- اس بیان سے کہ افرادِ عالم صورِ علمیہ الٰہی ہین، یہ مترشح ہوتا ہے کہ گویا افرادِ عالم کی زندگی کوئی جامد، ساکت، صامت اور غیر متحرک حقیقت ہے، اور ساکت اور غیر متحرک ہونے کی حیثیت سے وہ شاید کسی مخصوص تصور یا مخصوص مجموعۂ تصورات کے مترادف اور متوازن کی جا سکتی ہے، لیکن افرادِ عالم

کی زندگی ایک مسلسل اضطراب اور انقلاب ہونے کی وجہ سے ہر ایک تصور اور ہر ایک مجموعۂ تصورات میں نہیں ڈھالی جا سکتی، مثلاً انسان کوئی ایسا وجود نہیں، جو لفظ "انسان" میں سما سکے، اس کے وجود کو جس طرح چاہیے تصور کیجئے، مگر اس کی اصل حقیقت کو نہ کسی صورِ علمیہ کے ذریعہ بھی سمجھا جا سکتا ہے، اور نہ کسی امکانی مجموعۂ تصورات کے واسطہ سے محیط کیا جا سکتا ہے، "صورِ علمیہ الٰہی" بھی بحیثیت صورِ علمیہ اور وجدان سے قطعی مختلف ہونے کے سبب سے انسانی حیات کے سلسلۂ تغیرات و کیفیات و احساسات و حالات کے صحیح ترجمان نہیں بن سکتے،

تراد دیگر در سینہ بپیچد | جہانِ رنگ و بو را آفریدی
دگر از عشق بیباکم چہ رنجی | کہ خود این ہائے و ہو را آفریدی

۱۰- "صورِ علمیہ الٰہی" کے پس منظر پر اگر غور کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مفروضہ یہ ہے کہ ذاتِ خداوندی ہماری آپ کی طرح ایک متشخص ذات ہے، جو اگرچہ ورار الورے ہے، پھر بھی تعقل، تفکر اور تصورِ علمی کی حامل ہے، اسی کے تفکر سے جو شاید تصورات کے ذریعہ ہوا ہے، کائناتِ عالم کا وجود ظہور پذیر ہو سکا ہے، البتہ ہمارے اور باری تعالیٰ کے تصورات میں یہ فرق ہے، کہ ہمارے تصورات محض تصورات ہی کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن باری تعالیٰ ان تصوراتِ علمیہ کو خارج میں موجود اور خلعتِ وجود سے سرفراز فرما دینے کی بھی طاقت رکھتے ہیں، اس لئے ان کے "صورِ علمیہ" محض صورِ علمیہ نہیں رہتے، بلکہ خارج میں بھی وجود کے حامل نظر آتے ہیں،

لیکن ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ اقبال باری تعالیٰ کے وجود کو اس طرح متشخص[۱] اور ماورار[۲] تسلیم کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہیں، ایسی حالت میں اقبال کے فلسفہ میں صورِ علمیہ کی کوئی گنجائش ہی

---

[۱] اقبال اور جیمس وارڈ معارف بابت اگست و اکتوبر ۱۹۶۵ء عیسوی [۲] اقبال اور ولیم جیمس معارف بابت نمبر ۱۹۶۵ء

میں محصور نہیں کی جا سکتی،

۱۱- ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض جگہ اقبال کے بعض اشارات ہیگل اور برکلے کے طرزِ فکر کی حمایت اور غالب کے اس خیال کو ع

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

کی تائید میں نظر آتے ہیں، بعض اصحاب نے اس قسم کے اشارات کی بنا پر اقبال کو ہیگل اور برکلے کا موید تصور کر لیا ہے، مثلاً محترم ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب اقبال کے مندرجۂ ذیل اشعار کو جو باری تعالیٰ کی زبان سے کہلائے گئے ہیں، ہیگل اور برکلے کی تائید اور "اعیانِ ثابتہ" کی تجویز کی حمایت میں خیال فرماتے ہیں[۱]، اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ذوات "معلومات حق" ہیں، وہ اشعار یہ ہیں،

این جہان چیست صنم خانۂ پندارِ من است | جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من | چہ زمان و چہ مکان شوخیِ افکارِ من است

راقم کے حقیر خیال میں اقبال برگسان کے ہمنوا ہونے کی بنا پر کسی طرح بھی ہیگل کے طرزِ فکر کے حامی نہیں کہے جا سکتے، اور ہیگل کے طرزِ فکر کو رد کر دینے کے باوجود برگسان کے بتائے ہوئے وجدان کے ذریعہ خودی کا اثبات کرتے ہوئے بھی اقبال کا باری تعالیٰ کی زبان سے یہ کہلانا درست ہے کہ ع

این جہان چیست صنم خانۂ پندارِ من است

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ باری تعالیٰ کے تعقل اور تفکر کی بنا پر عالم کی تخلیق ہوئی ہے بلکہ یہ مقصد ہے کہ اوس کی "خودی فی نفسہٖ" عالم کی تخلیق کا باعث ہے[۲]، تعقل، تفکر، تصور

---

[۱] رموزِ اقبال (ص، ۲۷) [۲] باری تعالیٰ کی ذات اور عالم کے وجود میں کیا ربط ہے، یہ کچھ اس مقالہ میں جو اقبال اور رومی پر ہوگا، اور جو اس سلسلہ کا آخری مضمون ہوگا، انشاء اللہ العزیز بحث

سب ہمارے آپ کے لئے مخصوص ہیں، اور وہ سب ہماری ذات کے علاوہ کسی خارجی حقیقت کے بھی محتاج ہیں، جن کے بغیر تعقل، تفکر، اور تصور کی کار فرمائی عمل میں نہیں آسکتی، لیکن باری تعالیٰ کی ذات سے کوئی شے اور کوئی حقیقت خارج نہیں ہے، وہ بھلا کسی شے کا وجود اپنے سے خارج میں تصور فرما سکتا ہے؟[۱]

(باقی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۹) طور پر واضح ہوجائے گا۔ [۱] لکچرز اقبال

اعلان

سیرۃ النبی تقطیع کلان کی قیمتوں میں ترمیم

سیرۃ النبی تقطیع کلان (قدیم اڈیشن) کی حسب ذیل جلدیں ہمارے اسٹاک میں موجود ہیں، جو طباعت و کتابت کی پاکیزگی اور کاغذ کی عمدگی کے لحاظ سے معارف پریس کے گذشتہ دور کی خصوصیات کی حامل ہیں، ہم نے کسی زمانہ میں اُن کی قیمتوں میں غیر معمولی تخفیف ایک معین مدت کے لئے کردی تھی، لیکن اب اس کی مدت ختم ہو گئی، اس لئے یکم دسمبر ۵۱ء سے اُن کی قیمتوں میں مناسب ترمیم کر دی گئی ہے، پھر بھی وہ موجودہ دور کی شرح قیمت کے اعتبار سے کسی طرح زائد نہیں ہے، امید ہے تاجر اور اہل ذوق حضرات اس اعلان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے،

سیرۃ النبی حصہ	تقطیع	ضخامت	قیمت
سیرۃ النبی حصہ سوم	تقطیع کلان	ضخامت ۵۹۶ صفحے	قیمت :- ہے/
" " چہارم	"	" ۶۸۶ "	" عہ/
" " پنجم	"	" ۳۶۸ "	" معہ/
" " ششم	"	" ۶۱۲ "	" لعہ/ للعہ

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

لکھنؤ کی زبان

از

جناب شوکت سبزواری ایم اے لکچرار شعبۂ اردو فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی

"اس مضمون کے جواب میں اگر کوئی صاحب کچھ لکھنا چاہیں تو اس کو مسرت کے ساتھ شائع کیا جائے گا"۔ "م"

لکھنؤ کی زبان کا ایک مفہوم تو ادب میں ہے، یہ زبان کے ساتھ طرز بیان کو بھی شامل ہے یہاں لکھنؤ کی زبان سے مراد زبان و بیان سے متعلق لکھنؤ والوں کا ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ، ستھرا پن، زنگین، تکلف، اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ ہے، زبان کی اس کیفیت کو صناعی کہتے ہیں، آتش نے اسی "نگوں کا جڑنا" کہا تھا، اور غالب نے شاید لکھنؤ کی زبان کو اس کے اس ستھرے پن ہی کی وجہ سے مستند قرار دیا تھا، لکھنؤ کی زبان کا ایک مفہوم اور بھی ہے، جو خالص لسانیاتی ہے، اسی مفہوم سے اس وقت بحث ہے،

لکھنؤ کی زبان دلی اور دوسرے مقامات کی زبان سے جہاں اردو بولی جاتی ہے، مختلف نہیں، اور تھوڑا بہت اختلاف ان دو زبانوں میں ہے، وہ اتنا اہم نہیں کہ دلی اور لکھنؤ کی زبانوں کو اس کی وجہ سے جداگانہ اور مستقل حیثیت دی جاسکے، اور یہ کہا جاسکے کہ لکھنؤ کی زبان دلی سے الگ، اس سے مختلف، اور آزاد زبان ہے، لسانیات میں زبان کی جداگانہ تشکیل کے لئے کچھ شرطیں ہیں، کچھ خصوصیتیں ہیں، یہ شرطیں اور خصوصیتیں یہاں نہیں پائی جاتیں، اس لئے لکھنؤ کی زبان کو دلی کی زبان سے الگ کوئی مستقل درجہ حاصل نہیں جنھوں نے زبان کے مسئلوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ دلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو خلاف

اس سے کہیں زیادہ اختلاف ان زبانوں میں ہے، جو دو مختلف مقامات میں بولی جاتی ہیں لیکن اس اختلاف کی وجہ سے زبان کی پرکھ رکھنے والے ان مقامات کی زبانوں کو الگ الگ دو زبانیں نہیں ٹھہراتے اس فن کے جاننے والوں نے لکھا ہے کہ ایک مقام کی زبان دوسرے مقام کی زبان سے اور ایک فرد کی زبان دوسرے فرد کی زبان سے مختلف ہوتی ہی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ایک ہی زبان کہلاتی ہے، زبان تو بہت بڑی چیز ہے، ہم اس اختلاف کی وجہ سے ان دو مقامات کی زبانوں کو ایک زبان کی دو بولیاں بھی نہیں کہہ سکتے،

اردو نے دلی، میرٹھ اور اس کے نواح میں جنم لیا، اس کو قریب قریب فن کے سب ماہروں نے مانا ہے، لشکریوں کے ساتھ یہ زبان دکن اور گجرات پہنچی، یہاں کے لوگوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور یہاں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، یہ عین فطرت کے مطابق ہے کہ جو جہاں رہتا ہے، وہاں کے ماحول سے اثر لیے، زبان بھی فطرت کے اس اصول سے باہر نہیں، دکن و گجرات میں اردو نے آس پڑوس کی زبان سے بہت کچھ اثر لیا، ان زبانوں کے الفاظ، محاورے، اور بہت سی نحوی خصوصیتیں اور استعمالات خاموشی کے ساتھ اردو میں راہ پا گئے، اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے، کچھ زمانہ گزرنے پر وہ اردو کی اپنی چیز بن گئے تھا، دلی میں فارسی کا طوطی بول رہا تھا، اور بیچاری اردو کو کوئی منہ نہ لگاتا تھا کہ دکن سے شاعری کا غلغلہ بلند ہوا، نئی زبان، نئی لے، نئے خیالات، نئے انداز، یہ طرز سب کو بھایا، محمد شاہ کے عہد میں ولی کا کلام دلی پہنچ چکا تھا، دلی والوں نے اُسے آنکھوں سے لگایا، اور دل میں بٹھایا، گلی گلی ولی کا کلام پڑھا جانے لگا، قبول عام نے دلی والوں کو بھی شوق دلایا، انھوں نے بھی ریختہ میں شعر کہے، اردو شاعری سے دلی کی فضا گونجنے لگی، غالب نے لکھا تھا،

"تم نے ولی کے دیوان کا حال سُنا ہوگا کہ دلی میں آیا تو جیسے کسی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں، اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے"،

یہ عجیب سی بات ہے کہ اردو جب تک دلی میں رہی، بول چال کی زبان سے آگے نہ بڑھ سکی، اور کسی کو اس کا خیال تک نہ ہوا کہ یہ ایسی چونچال بھی ہے کہ نازک خیالات اور لطیف جذبات کے اظہار کا ذریعہ بن سکے لیکن جب وہ دکن کے سفر سے دلی واپس آئی، تو دلی والوں کو اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کا احساس ہوا، اور وہ اس کو وہ مقام دینے کے لئے تیار ہو گئے، جس سے اب تک وہ محروم چلی آرہی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ اردو زبان دکن سے واپسی کے بعد اتنی بدل گئی تھی، اور وہاں کی بولیوں نے اس کے مزاج میں اتنا اثر کر لیا تھا کہ وہ ایک نئی زبان معلوم ہوتی تھی، دلی پہنچ کر زبان نے چولا بدلنا شروع کیا، دکنی الفاظ اور محاورے متروک ہونے لگے، اور نئے سرے سے زبان کو سنوارا جانے لگا، دلی کی بابت یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر چند وہ دکن کی پیداوار تھے، اور گجرات سے ان کو تعلق رہا تھا، لیکن اردو کی اصلاح و تہذیب اور غیر ملکی زبانوں کے اثرات سے پاک کرنے میں اُن کا حصہ بھی ہے، اردو میں اصلاحی تحریک کا آغاز ولی کے زمانہ سے ہی ہو گیا تھا، یہ بات ولی کے آخری دور کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈال لینے سے واضح ہو جاتی ہے،

قیاس کیا جاتا ہے کہ ولی کی شاعری کے اس دور کا آغاز ۱۷۰۰ء کے لگ بھگ ہوا، جب وہ پہلی مرتبہ دلی آئے، وہاں کے اہلِ دانش و بینش سے ملے، اور انھوں نے دیکھا کہ وہ جس زبان میں نغمہ سنجی کر رہے ہیں، دلی کی زبان ہوتے ہوئے بھی وہ دلی کی نہیں، اردو زبان پر بیرونی اثرات اور ولی کی اصلاحی خدمات کا اعتراف دکن و گجرات کے اہلِ علم کو بھی ہے، چنانچہ گجرات کالج احمد آباد کے استاد ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے :-

"سلاطینِ گجرات و دکن اور صوفیاء کے بعد اورنگ زیب کے زمانہ میں ولی کا دور آتا ہے، تاریخ ادب اردو میں یہ ایک انقلابی دور ہے، اس دور تک گجرات و دکن میں اردو دوسری مقامی زبانوں کے اثرات کے ساتھ بولی اور لکھی جاتی تھی، اور کسی قسم کا ایک معیار مقرر

نہین تھا، مگر ولی ایک ایسا مصلح شاعر پیدا ہوا، جس کی دور بین نگاہ نے زبان وادب کی مشکلات اور ترقی کی دشواریون کو پالیا، اوران گتھیون کو سلجھایا، اور ایک شاہراہ قائم کردی، اوراس طرح شمال، گجرات اور دکن کے فرق کو مٹاکر وحدت لسانی قائم کردی، اور زبان کا ایک معیار قائم کردیا،[1]

ولی کی اصلاحی تحریک لسانی اعتبار سے کوئی بڑی تحریک نہین، اور نہ اُس کا تعلق زبان کی تہذیب و تحسین ہی سے ہے، ولی اول اول خالص دکنی مین شعر کہتے تھے، اور دکنی الفاظ اور محاورے کثرت کے ساتھ استعمال کرتے تھے، لیکن آخری زمانہ مین اونھون نے یہ روش ترک کردی، فارسی الفاظ، فارسی ترکیبین، اور فارسی محاورات کے اردو ترجمے وہ زیادہ استعمال کرنے لگے، اس کے سوا مجھے ان کے آخری کلام مین اور کوئی نمایان فرق نظر نہین آتا، اس زمانے مین بھی انھون نے جہان اردو الفاظ استعمال کئے ہین، وہ دکنی محاورے اور گجراتی بول چال کے مطابق ہین، صرف اتنی سی بات ہے کہ دکنی الفاظ اور محاورے اس مین کم استعمال ہوئے ہین،

اصلاح کا اصلی اور بنیادی کام مرزا مظہر جان جانان رحمۃ اللہ علیہ سے شروع ہوا، اور میر و مرزا کے عہد تک جاری رہا، ہمارے تذکرہ نگارون نے اس کی تفصیلات دی ہین، لیکن چونکہ یہ بزرگ اردو زبان کی تاریخ اس کے مزاج اور ارتقائی دورون سے باخبر نہ تھے، اس لئے وہ اردو مین اصلاحی تحریک کی اصل غایت کا پتہ نہ لگا سکے، اور اس کے لسانی پس منظر کی کوئی واضح اور روشن تصویر پیش کرنے مین اُن کو کامیابی نہ ہوئی، اس سلسلے مین سب سے اہم بات یہ ہے کہ اول یہ معلوم کیا جائے کہ اس اصلاحی تحریک کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ ہمارے مصلحین کا کوئی استبدادی

---

[1] اردو جنوری ۱۹۳۸ء

فعل تھا کہ وہ بغیر کسی لسانی جواز کے ہندی الفاظ اور دکنی محاورے ترک کرتے جا رہے تھے، اور بعض لفظون کی تراش خراش مین لگے ہوئے تھے، اور انھین حسب دل خواہ توڑ مروڑ رہے تھے، یا اوس کے لئے کوئی لسانی جواز بھی تھا، لسانی جواز یہ ہے کہ شمالی ہندوستان مین اس وقت جو زبان عوام بول رہے تھے، اس مین یہ متروک الفاظ اور محاورے رائج نہ تھے، اور جن اسماء و حروف مین تراش خراش کی جارہی تھی، وہ وہان کے عوام کی بول چال اور محاورے کے مطابق تھی، ان مین پہلی صورت تو ممکن ہی نہین، یہ بات لسانیات مین ثابت ہو چکی ہے کہ کوئی فرد خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کا مالک کیون نہ ہو، زبان کا دھارا بدلنے اور اوس کا رُخ موڑنے کی طاقت نہین رکھتا، اس لئے اس کا دوسرے سے سوال ہی پیدا نہین ہوتا، اب صرف دوسری صورت رہ جاتی ہے، وہ یہ کہ اردو جب شعر و شاعری کے روپ مین دلی پہنچی، تو دلی کے محاورے کے مطابق نہ تھی، دکن و گجرات کی زبانون نے اس کو مسخ کر دیا تھا، مصلحین زبان نے ترمیم و تنسیخ کے بعد اس کو اپنے محاورے کے مطابق بنایا، اور باہر کی غیر صالح آمیزش سے پاک کرکے اس کو نکھارا، ان کا یہ کام فطرت کے مطابق تھا، عوام تو پہلے ہی دکنی الفاظ اور محاورون سے آشنا نہ تھے، خواص البتہ دکنی شعراء کی پیروی مین ان متروکات کو کلیجے سے لگائے ہوئے تھے، وہ بھی ترک کرنے لگے، اور اردو زبان عوام کی روزانہ بول چال کے مطابق ڈھلنے لگی،

مصلحین زبان نے جن الفاظ، افعال، اور محاورات کو متروک قرار دیا، اور جن مین تراش خراش کی، ان کی ایک تشنہ سی فہرست صاحب جلوۂ خضر نے اپنے تذکرے مین دی ہے، اور مین نے اپنی تصنیف "اردو زبان کی لسانی تاریخ" مین ان الفاظ و حروف کی سرگذشت بتاتے ہوئے تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ دکن کی آس پاس کی زبانون سے کہان کہان سے لئے گئے، اس مقام پر اس تفصیل کی گنجایش نہین، مین نے اس بحث کو یہان اس لئے چھیڑا ہے کہ یہ بتا سکون کہ اردو کا اصلی مرکز دلی، میرٹھ اور اس کے نواح کے اضلاع ہین، زبان کا کالبد یہین تیار ہوا، اور یہین اوس نے نشو و نما پایا، اس کے بعد

زبان جہان گئی، وہان کی زبانون کی کچھ خصوصیات اس نے لے لین، اوران مین سے جو اس کے مزاج کو ساز گار نہ تھین، اہل زبان نے اُن کو قبول نہ کیا، اور وہ ترک کر دی گئین، اصلاحی تحریک کے سلسلہ مین مظہر، حاتم، اور میر و مرزا کا ذکر اوپر آچکا ہے، دلی مین تحریک کے علم بردار یہی تھے، ان کی اصلاحی کوششین ایک حد تک بارآور ہوئین، لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے کہ کچھ الفاظ، محاورے، اسما اور افعال زبان مین اچھی طرح جڑ پکڑ چکے تھے، وہ باقی رہ گئے، ان مین سے بعض الفاظ و محاورات کو زبان سے صاف کرنے اور بعض مین زبان کے مزاج کے مطابق مناسب اصلاح و ترمیم کا کام ناسخ نے انجام دیا، ناسخ کی بابت مین ایک مضمون مین تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہون کہ اُن کی اصلاحی تحریک مظہر جان جانان اور ظہور الدین حاتم کے سلسلۂ اصلاح کی ایک کڑی ہے، اور اس کا تعلق کسی طرح بھی زبانون کے اس حلقے سے نہین، جو لکھنؤ اور اُس کے نواح مین بولی جاتی تھین، اس بحث سے مجھے سرسری گذر جانا ہے!

آئے ہے، جائے ہے، فعل حال کا استعمال غالب کے یہان بھی ہوا ہے، یہ دلی کی زبان نہ تھی، کنی ادب کی پیداوار سے بہت پہلے دلی والے جاتا ہے، آتا ہے، بولتے تھے، امیر خسرو کے یہان فعل حال کی یہی صورت ملتی ہے، ان کا ایک شعر ہے،

یار نہین دیکھتا ہے سوے من بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھ ہے

شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ شیرانی نے سیر الاولیا، سے نقل کیا ہے "پونون کا چاند بالا ہوتا ہے،" گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ امیر خسرو سے بھی تقریباً دو سو سال پہلے تھے، میرا اور تیرا کی جگہ مجھ اور تجھ، کسی کی جگہ کسو، آگے کی جگہ آگو، نہ کی جگہ نین، ناسخ کے زمانہ تک دہلی کے فصحا کی زبان تھی، کبھو، کدھی، تجھ، تد، تس پر، تئین، ٹک وغیرہ عام طور سے استعمال مین آتے تھے، ناسخ نے اُن پر خط نسخ کھینچا، ناسخ کو صحت زبان کا خاص خیال تھا، اُن کی شاعری جو بے جان سی ہے، اس کی وجہ ہی بعض اہل علم نے یہ بتائی ہے کہ وہ مضمون سے زیادہ زبان کی صحت اور لفظون کی تراش خراش

زور دیتے تھے "تئین" کی بابت غالب لکھتے ہین" یہ پنجابی ہے، پنجاب کے احاطے سے دلی مین داخل ہوا، ایک بڑھیا ہمارے ہان نوکر تھی، وہ یہ لفظ بولا کرتی تھی، تو بیبیان اور لونڈیان سب اس پر ہنستی تھین"

حرف "نے" کے استعمال مین خصوصیت کے ساتھ بے تکاپن برتا جاتا تھا، مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ میر و سودا کے زمانہ مین بھی اس حرف کے استعمال مین بے قاعدگی پائی جاتی تھی، اُن کے نزدیک اس کے استعمال کے قواعد حال مین منضبط ہوئے ہین، اگرچہ یہ شرف ناسخ کو حاصل نہین، لیکن اس مین کوئی کافر ہی شبہہ کرسکتا ہے کہ زبان کے اس ہیر پھیر "نے" کے صحیح اور باموقع استعمال سے اُس کا ایک معیار قائم کیا،

ناسخ کی اصلاحات کا سلسلہ بہت طویل ہے، ان کی ان مساعی کو اس زمانہ مین بھی سراہا گیا اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ زباندانون نے ان کی اصلاحات کو سرآنکھون پر لیا، اور ان الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا، جنھین ناسخ نے متروک قرار دیا تھا، آج بھی مصلح زبان کے خطاب سے ان کو سرفراز کیا جاتا ہے، کیون؟ اس لئے اور محض اس لئے کہ ناسخ نے اردو زبان کو دوسری زبانون کے اثرات سے جو اُس کے مزاج اور سرشت کے موافق نہ تھے، پاک کیا، ناسخ زبان کی شریعت کے مجدد ہین، اُن کی لسانی تجدید نے اردو زبان کو نکھار کر نیا رنگ روپ دیا، اور اس کو نئی زندگی بخشی،

لکھنؤ اردو کا وطن نہین، نہ وہ اس کا مولد ہی ہے، اور نہ منشا ہی، میرا خیال ہے کہ یہ دو نہین ہوسکتین، لکھنؤ نے اردو کو جگہ دی، اور اس کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا آلہ بنایا، اردو کی بڑی خوش بختی ہے کہ وطن سے دور اکثر پردیس مین اس کو پھلنے پھولنے کے مواقع ملے، دکن مین یہ لشکریون کے ساتھ پہنچی، اور لکھنؤ امیرون، شریفون اور شاعرون کے ساتھ، لکھنؤ کی زبان مین جو بانکپن اور رئیسانہ تکلف ہے، وہ اردو زبان کے لکھنوی مربیون کی تہذیبی قدرون کا اثر ہے، لکھنؤ کی اردو زبان بھی وہان کے ادب کی طرح لکھنؤ کی تہذیب اور اُس کی آن بان کی آئینہ دار ہے، ایک پہلو تو اس مسئلے

کا یہ ہے اور اس کی طرف مین پہلے اشارہ کر آیا ہون، اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، اور وہ یہ کہ ہر چند لکھنؤ کی زبان امیر زادون کی گود مین پلی، اور محلون مین پروان چڑھی، لیکن لکھنؤ اور اُس کے آس پاس کا علاقہ اودھی اور اس کے حلقے کی دوسری بولیون کا علاقہ ہے، یہان کے عوام کی زبان اور بولی ٹھولی اردو نہ تھی، یہ پوربی بولتے تھے، گھرون مین اور گلیارون مین اسی کا سکہ چلتا تھا، دربار مین اردو بولنے والون کے گھر بار کی زبان پوربیا تھی، جس طرح دکن مین اردو مقامی بولیون سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی، اسی طرح لکھنؤ مین بھی اوس نے اودھی کی بہت سی خصوصیات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کر لیا، لکھنؤ نہ تو ن اردو کا مرکز رہا، اس کی خاک سے بڑے شاعر کم اور اچھے فن کار زیادہ اٹھے، جنھون نے اردو مین اپنے فن کے قابل قدر نمونے چھوڑے، کچھ ان فن کارون کی عظمت اور بڑی شخصیت کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اردو مین کوئی دوسرا ناسخ نہین ہوا، اودھی کے اثرات برابر اردو مین کام کرتے رہے، اور آخر ایک زمانہ آیا کہ لکھنؤ کو دلی کے مقابلے مین ایک آزاد اردو مرکز کی حیثیت دیدی گئی، اور دلی اور لکھنؤ کے درمیان حریفانہ رقابت کا سلسلہ قائم ہو گیا،

یہ تو مین پہلے عرض کر چکا ہون کہ دلی اور لکھنؤ کی زبان مین کچھ زیادہ فرق نہین، بلکہ جہان تک زبان کے کینڈے کا تعلق ہے، ان مین کوئی فرق ہی نہین، اس سلسلہ مین دو ایک رجحانون کا ذکر مین کرنا چاہتا ہون، اُن سے آپ کو لکھنؤ کی زبان پر اودھی اثرات کا پتہ لگ سکے گا، سب سے زیادہ اہم اور نمایان رجحان لکھنؤ کی زبان کا یہ ہے کہ اس مین اسمار اور الفاظ کی تذکیر و تانیث کا کوئی معیار نہین، بہت سے الفاظ جو دلی مین مذکر ہین، لکھنؤ والے ان کو مونث بولتے ہین، اور اُس کے برعکس مونث کو مذکر، اس کی ایک بھونڈی صورت یہ ہے کہ عربی مونث الفاظ کی جمع کو بھی وہ مذکر بتاتے ہین، اردو مین مونث اسمار کی جمع کا آخری حرف "ی" ہے، فاعلی حالت مین جمع "ین" بڑھا کر بنائی جاتی ہے،

جیسے عورتین، اُمین، راتین گذرین، لکھنؤ والے یہ قاعدہ مذکر اسمار مین بھی جاری کرتے ہین، اور لفظ کی جمع لفظین، برس کی برسین، چیت کی چیتین اور شیر کی شیرین بناتے ہین، یون تو دلی مین بھی تذکیر و تانیث کا کوئی ٹھکا بندھا اصول نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے، لیکن اردو وہان کی پیداوار ہے، وہین کے آب و گل سے اس کا خمیر تیار ہوا، وہان کے باشندے ہی اس کے مزاج شناس ہو سکتے ہین، وہ اس کی فطرت کو جانتے ہین، اس کی افتادِ طبع پہچانتے ہین، وہ اپنے ذوق سے یہ فیصلہ کرتے ہین کہ کونسا لفظ اردو مین مونث ہے، اور کونسا مذکر، ایک مزاج داں طبیب ہی بتا سکتا ہے کہ کونسا ان مریض کے انگ لگے گا اور کونسا نہین،

اس کے علاوہ لکھنؤ والے ویسے بھی لفظون کی تذکیر و تانیث کا مذاق نہین رکھتے، وہ اس کا صحیح احساس کر ہی نہین سکتے، لکھنؤ کی بابت مین پہلے عرض کر چکا ہون کہ وہ اودھی علاقے مین ہے، لسانی اعتبار سے یہ حلقہ مغربی ہندی اور بہاری کے درمیان مین ہے، بابو رام سکسینہ جنھون نے اودھی پر تحقیقی کام کیا ہے، لکھتے ہین :-

"جہان تک اسمار و صفات کی تذکیر و تانیث کا تعلق ہے، مغربی ہندی بڑی سختی کے ساتھ اس کی پابند ہے، اودھی اس مین کسی قدر نرم ہے، رہی بہاری سو وہ اکثر و بیشتر مذکر و مونث کا فرق نہین کرتی"،

اردو مغربی ہندی کے حلقۂ اثر کی زبان ہے، تذکیر و تانیث کا فرق اس کی گھٹی مین پڑا ہوا ہے، لکھنؤ اس حلقہ سے باہر ہے، وہان کے رہنے والے تذکیر و تانیث کا شعور اگر رکھتے بھی ہین، تو وہ اس درجہ کا نہین، جو دلی والون کا ہے، اس لئے اس کوچہ مین آکر ان کا بھٹک جانا تعجب کی بات نہین،

"نے" کی بابت مین اوپر لکھ آیا ہون کہ اس کے استعمال کے قواعد مولوی عبدالحق کے نزدیک

حال ہی مین منضبط ہوئے، اگر ائرسن نے بھی کسی جگہ اس سے ملتی جلتی بات کہی ہے، اٹھارہوین صدی عیسوی کے آغاز کو وہ نے کے صحیح استعمال کی تاریخ بتاتے ہین، دلی اور اس کے نواح مین بھی 'نے' کا صحیح استعمال کرنے والے لوگ بہت کم تھے، پنجاب مین آج کل بھی نے کا استعمال برمحل نہین ہوتا، اودھی مین تو سرے سے نے کا وجود ہی نہین، اس لئے کچھ زیادہ تعجب کی بات نہین، اگر لکھنؤ والون سے اس کے ترک واختیار مین لغزش ہوجائے، حال ہی مین لکھنؤ کے بعض اہلِ قلم کے یہان مین نے دیکھا کہ وہ فعل "بولنا" کی ماضی کے ساتھ، جب وہ متعدی بھی ہے اور اس کا مفعول بھی مذکور ہے "نے" نہین لاتے، مثلاً وہ یون لکھتے ہین:-

"مرد جھوٹ بولا، عورت جھوٹ بولی، وہ دو جملے بولا وغیرہ"

دلی اور اس کے نواح مین اُس نے جھوٹ بولا، اور اُس نے دو جملے بولے، یون کہتے ہین، مین یہ سمجھے ہوئے تھا کہ یہ لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہین، شاید ان اہل قلم کی بے خبری ہے، جن کے یہان مین نے یہ جملے اس طرح استعمال ہوتے دیکھے لیکن میرے ایک رفیق کے دریافت کرنے پر جب پروفیسر مسعود حسن رضوی نے جن کا شمار لکھنؤ کے مستند اہلِ قلم اور اہلِ زبان مین ہوتا ہے، اُس نے دو جملے بولے کو غیر فصحا کی زبان بتایا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، اور مین یہ سمجھنے پر مجبور ہوا کہ یہ لکھنؤ کی زبان ہی کی خصوصیت ہے کہ 'بولا' فعل متعدی کے ساتھ 'نے' نہ لایا جائے، اگر یہ صحیح ہے کہ اس کو بھی اودھی ہی کا اثر سمجھنا چاہئے، 'بولنا' اردو مین لازم بھی ہے، اور متعدی بھی، وہ بولا (لازم)، اس نے جھوٹ بولا (متعدی)، متعدی کے ساتھ 'نے' آنا چاہئے، 'نے' دراصل نائب فاعل یعنی (agent) کی علامت ہے، جو سنسکرت ([illegible]) کا مقلوب ہے، اردو کا یہ استعمال سنسکرت کے جس استعمال سے لیا گیا ہے، اسے کرمنی پریوگ (مجہولی استعمال) کہتے ہین، اس مین فعل مفعول کے مطابق ہوتا ہے، اور فاعل جس پر نے آتا ہے فعل

کے صدور کا ایک آلہ اور ذریعہ سمجھا جاتا ہے، یہ استعمال فعل متعدی کے ساتھ مخصوص ہے، اور مغربی ہندی کے حلقے کی زبانون مین دیکھا گیا ہے، لکھنؤ والون کو اس کے استعمال مین اشتباہ دو وجہ سے ہوا، ایک تو اس فعل کے اردو مین بکثرت لازمی استعمال سے ظاہر ہے ایک دو مثالون کو چھوڑ کر اردو مین ہر جگہ یہ فعل لازم ہے، کثرت استعمال سے اُس کی ایک خاص وضع کا زبان پر چڑھ جانا اور طبیعتون کا عادی ہو جانا معمولی سی بات ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ اردو مین وہ بول بولا، وہ بولی بولا، یہ جملے بھی ہین، سمجھا یہ گیا کہ بول اور بولی مفعول بہ ہین، اور بولا ان جملون مین متعدی ہے اس کے باوجود نے کے بغیر استعمال ہوا ہے، حالانکہ یہ بات طے نہین، بولی اور بول ان جملون مین مفعول بہ نہین، بلکہ مفعول مطلق ہین، جو بولنا سے لئے گئے ہین، اور اسی مادے سے مصدر یا حاصل مصدر ہین،

مین محسوس کر رہا ہون کہ بحث خشک ہوتی جا رہی ہے، لیکن مجبوری ہے، لکھنؤ کی زبان پر اودھی اثر دکھانے کے لئے یہ صرفی اور لسانی بحثیں ضروری ہین، اردو مین تاکید وحصر کے لئے ہی بطور لاحقہ استعمال ہوتا ہے، جیسے وہی اور انہی وغیرہ، اس لاحقے کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے، یہ سنسکرت (एव) اور (हि) کی تالیف ہے وترکیب کی پیداوار ہے، اس کے مختلف طلقے ڈاکٹر سکسینہ کی تحقیق کے مطابق اس طور پر ہین، ۱ एव - हु - हे + हि ہی جب کسی بات پر زور دینا مقصود ہوتا ہے، یا حصر کا اظہار تو کلمے کے آخر مین ہی اضافہ کر دیتے ہین، اس مین مفرد یا جمع کی تمیز نہین، وہ پر بھی 'ہی' اضافہ کیا جاتا ہے، اور ان پر بھی، لکھنؤ والون نے اودھی کے زیر اثر جمع کی صورت مین ہی کو ہیں بنا دیا، وہ ان ہی کو انہین، اور ہم ہی یا ہمین کہتے ہین، ایک تو اردو مین 'ہین' کوئی علامت حصر نہین، دوسرے سنسکرت یا پراکرت مین کوئی کلمہ نہین، جسے اس کی اصل قرار دیا جا سکے، 'ہین' البتہ قدیم اودھی ادبیات مین استعمال ہوا ہے، لکھنؤ والون نے اس کو وہین سے لیا ہے،

'ہی' کا مخفف اردو میں 'ہی' ہے، جیسے سبی، جبی، تبی، وغیرہ،

آخر میں ایک نقطہ کی طرف اہل علم کو توجہ دلانا ضرور ہے، اردو علامت مصدر 'نا' کا استعمال اردو میں بطور استقبال بھی ہوا ہے، جیسے مجھے سبق پڑھنا ہے، روٹی کھانی ہے، یہ 'نا' سنسکرت (अनीय) کے قائم مقام ہے، سنسکرت میں یہ صفت یا فاعل کی علامت ہے، فارسی 'نی' بھی اسی سے ہے، کردنی، کرنے کے قابل، جو آیندہ کیا جائے، کرنا اصل میں 'کرنی' تھا، 'ی' کو تانیث کی علامت سمجھ کر 'نا' اس کا مذکر بعد میں تراش لیا گیا، دہلی والے کھانا، کرنا وغیرہ کو قاعدے کے مطابق اور اصل کے لحاظ سے مونث اسم کے ساتھ مونث اور مذکر کے ساتھ مذکر استعمال کرتے ہیں، لکھنو والے اس نکتہ کو نہ پا سکے، وہ اس کو مصدر سمجھتے ہیں، اور ہر حال میں بصورت مذکر کھانا لانا بولتے ہیں، یہ اُن کی اپج سہی، لیکن اصلیت سے دور ہے،

لکھنو کی زبان پر اودھی اثرات کا یہ مختصر سا جائزہ ہے، اردو دلی کی زبان ہے، دلی والے ہی دراصل اہل زبان ہیں، جس طرح وہ بولتے یا لکھتے ہیں، وہ سند ہے، میر انیس ایسی ہی موقع کے لئے فرمایا کرتے تھے،

"یہ میرے گھر کی زبان ہے، حضرات لکھنؤ یوں نہیں بولتے،"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستانی مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک

محمود غزنوی عام طور سے ایک بدنام اور بُت شکن حملہ آور ہی کی حیثیت سے مشہور ہے، لیکن ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے جو آج کل الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ پالیٹکس کے صدر ہیں اپنی مشہور و معروف کتاب میڈیول انڈیا میں اس کا جو قلمی خاکہ کھینچا ہے، اوس کی تلخیص ہم معارف کے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں :-

"محمود ایک جلیل القدر بادشاہ تھا، اوس نے محض اپنی قوتِ بازو سے ایک چھوٹے سے پہاڑی علاقہ کو ایک وسیع اور خوشحال سلطنت میں تبدیل کر دیا تھا، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا، یہ صحیح ہے کہ اس کے اس عروج و اقبال کے لئے حالات بھی سازگار ہوئے، شمال میں اوس کی ہمسایہ سلطنتوں میں کچھ ایسے عجیب و غریب حالات پیدا ہو گئے تھے کہ ان کے حکمران اپنی حکومت قائم و برقرار رکھنے سے بالکل معذور ہو رہے تھے، اسی لئے محمود کو اپنے سیاسی اور سپاہیانہ کمالات کے دکھانے کے مواقع ملتے گئے، سامانیوں کا خاتمہ ہو چکا تھا، ہندوستان میں ہندو حکمرانوں میں باہم کچھ ایسا نفاق اور کچھ ایسی رقابت تھی کہ وہ اپنے کسی مشترکہ دشمن کے خلاف متحدہ محاذ قائم نہیں کر سکتے تھے،

ایران کی حکومت زوال پذیر تھی، ان حالات کے مقابلہ مین نومسلم ترک غیر معمولی جوش و خروش سے
بھرے ہوئے تھے، جس سے محمود کو قدم قدم پر کامیابیان حاصل ہوتی گئین، اور وہ جہان بھی حملہ آور
ہوا فتح و کامرانی نے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا، ہندوستان کو مستقل طور پر تسخیر کرنا ممکن نہ تھا، اور
نہ محمود کی وہ آرزو بھی نہ تھی، ترک، افغانستان کے سبزہ زارون اور وہان کی پہاڑی چراگاہون کو زیادہ
پسند کرتے تھے، ہندوستان کی آب و ہوا اُن کے موافق بھی نہ تھی، محمود ہندوستان آکر یہان کی
دولت زیادہ سے زیادہ سمیٹ کر اپنے وطن کو واپس چلا جاتا، اور پھر مستقل فتح و تسخیر سے بے نیاز ہو جاتا،
لیکن یہ خود ایک عظیم الشان کام تھا، ہندوستان آنے مین قدرتی مشکلات کے علاوہ یہان کے باشندون
کی طرف سے جو رکاوٹین حائل ہوتی رہین، اُن پر قابو پانا انسانی قوت سے باہر تھا، لیکن محمود کے جسم
مین وہی روح تھی، جو شہدار کے جسم مین ہوا کرتی ہے، وہ جسمانی راحت و آسایش کی مطلق پرواہ نہ
کرتا تھا، راجپوتانہ کے ریگستانی میدانون کو عبور کرکے گجرات کے دور دراز علاقہ سومنات مین ڈ
جن طرح طرح کی رکاوٹون کے ساتھ پہونچا ہے، وہ اس کے غیر معمولی نکتہ رس ذہن، اور حیرت انگیز
جرأت و دلیری کی دلیل ہے، اس نے ہندوستان کے پہلے ہی حملہ مین ہندوؤن کے سیاسی نظام
کی کمزوریون کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، نپولین اعظم کہا کرتا تھا کہ جنگ مین انسان دماغ ہی دماغ بن
کر رہ جاتا ہے، محمود کی تمام سپاہیانہ زندگی شروع سے آخر تک اسی مقولہ کا عملی نمونہ ہے،

محمود کو وسط ایشیا کی طرف سے اپنی سلطنت پر حملہ کا خطرہ برابر رہا، لیکن اس شمالی سرحد کے
تحفظ و مدافعت مین اوس نے کسی فکر و تدبر کا اظہار نہین کیا، پھر بھی اس سمت اس کی قوت قائم رہی،
اور وہ اپنے کو ایسے دشمنون سے لڑنے کے لئے برابر تیار رکھتا جو اس کے اقتدار اعلیٰ مین خلل انداز ہونا
چاہتے تھے، وہ پیدائشی سپہ سالار تھا، لڑائی سے کبھی گریز نہین کرتا، بلکہ جنگ کرنے مین اوس کو
لذت محسوس ہوتی تھی، اس کی سرگرمیون مین اس خیال سے اور بھی اضافہ ہو جاتا تھا کہ وہ

جو کام انجام دیتا ہے، اس سے اسلام کی شان و شوکت بڑھتی ہے،

محمود نے جب ۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ کو وفات پائی، تو اوس نے نہ صرف کثیر دولت چھوڑی،
بلکہ اس کی سلطنت بخارا و سمرقند سے گجرات و قنوج تک پھیلی ہوئی تھی، جس مین افغانستان، ماوراء النہر،
خراسان، طبرستان، سیستان، کشمیر اور شمال مغربی ہند کے بہت سے علاقے بھی شامل تھے،

محمود ایک بہت بڑا فاتح ضرور تھا، لیکن اس مین بربریت نہ تھی، وہ خود تو ان پڑھ تھا[1] لیکن وہ
آرٹ کا دلدادہ اور اہل علم کا بڑا مربی تھا، وہ شعراء کے کلام اور علماء کی گفتگو کو بڑے شوق سے سنتا
اور اسکی سرپرستی کی وجہ سے مشہور شاعرون اور ادیبون کا ایک بڑا حلقہ اُس کے ارد گرد جمع ہو گیا تھا،
ایشیا کے ہر حصہ سے اہل علم اس کے دربار مین کھنچے چلے آتے تھے، شعراء اس کی مدح مین قصائد کہتے،
اوس کو بھی شعر و شاعری سے کچھ ایسا ذوق پیدا ہو گیا تھا کہ بڑی سے بڑی مہم مین بھی وہ تھوڑا سا
وقت اچھی غزل اور اچھی رباعیات سُننے کے لئے ضرور بچا لیتا تھا اس زمانہ کے جتنے جید اور ممتاز اہل علم
تھے، سب اس کے گرد جمع ہو گئے تھے، ان مین البیرونی جیسا مشہور ریاضی دان، ماہر ہیئت، اور
سنسکرت کا عالم بھی تھا، عتبی اور بیہقی جیسے مورخ بھی تھے، اور فارابی جیسا فلسفی بھی تھا، یہ شعر و
شاعری کا زمانہ تھا، اور محمود کے دربار کے شعراء کی شہرت تمام ایشیا مین پھیل ہوئی تھی ان شعرا
مین عنصری کو محمود نے ایک چھوٹے سے قصیدہ کے صلہ مین چودہ ہزار درہم دیئے تھے، عنصری اس
عہد کا سب سے باکمال شاعر تھا، فرشتہ کا بیان ہے کہ چار سو شعراء اور اہل علم اور اُن کے ساتھ غزنین
کے جامعہ کے سارے طلبہ عنصری کی شاگردی کا دم بھرتے تھے، اسدی طوسی، عسجدی اور فرخی بھی
محمود کی فیاضیون سے سیراب ہوتے رہے، ان شعراء مین فردوسی نے غیر معمولی شہرت حاصل کی جس نے
شاہنامہ لکھ کر محمود کو تاریخ مین غیر فانی بنا دیا ہے[2]

---

[1] معارف تعجب ہے کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد جیسے وسیع النظر مورخ نے یہ بات کیسے لکھدی [2] معارف ڈاکٹر ایشوری

سلطان محمود عدل و انصاف مین بڑا ہی سخت تھا، اور اپنی رعایا کی جان و مال کی حفاظت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا، ایک مرتبہ ایک شخص نے سلطان محمود سے شکایت کی کہ سلطان کے بھتیجے نے اسکی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کر رکھے ہین، اور بہت کہنے سننے سے بھی وہ کسی طرح باز نہین آتے، محمود نے اس شخص کو حکم دیا کہ اس کا بھتیجا جب اوس کے مکان پر آئے، تو وہ آکر اسکو خبر کرے، اُس شخص نے اس حکم کی تعمیل کی، سلطان ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہن کر اُس کے ساتھ اُس کے گھر پر آگیا، اور گھر پہنچکر چراغ گل کرا دیا تاکہ بھتیجے کو دیکھکر رحم و محبت کا جذبہ پیدا نہ ہو جائے، اور وہ ایک فرضِ انجام دینے مین قاصر نہ رہے، اس کے بعد مجرم بھتیجے کا سر اُسکے جسم سے علٰحدہ تھا، ایک بار شہزادہ مسعود کے خلاف غزنی کے کسی تاجر نے کچھ رقم کی عدم ادائگی کی شکایت کی، تو شہزادہ کو قاضی کی عدالت مین حاضر ہو کر رقم ادا کرنی پڑی، اور یہ حکایت تو بہت مشہور ہے کہ ایک بڑھیا نے محمود کو یہ کہکر ڈانٹا کہ جب وہ دور دراز علاقے مین عدل و انصاف کی حکومت قائم نہین کر سکتا ہے، تو پھر اُن کو تسخیر ہی کیون کرتا ہے،

محمود پر الزام یہ ہے کہ وہ دولت کا بڑا حریص تھا، مسلمان مورخین لکھتے ہین کہ جب وہ مر رہا تھا، تو اُس نے ساری جمع شدہ دولت کو اپنی نظرون کے سامنے لانے کا حکم دیا، اس کو اپنی وفات کے وقت اتنی بڑی دولت سے علٰحدہ ہونے کا بڑا غم تھا، اس مین شک نہین کہ محمود کو دولت کی حرص ضرور تھی، اور اسی لئے اُس نے دور دراز علاقون مین جا کر جنگ کی، لیکن اس مین بھی کلام نہین کہ اگر اُس نے دولت جمع کی تو بڑی فیاضی کے ساتھ اس کو خرچ بھی کیا، اوس نے علوم و فنون کو فروغ دینے کے لئے غزنی مین ایک یونیورسٹی قائم کی، جہان ایک کتب خانہ اور ایک ایسا میوزیم بھی تھا جس کو اُس نے جنگ کے مالِ غنیمت سے آراستہ و پیراستہ کر رکھا تھا، اس کی فیاضی ہی کی وجہ سے

(بقیہ حاشیہ ص۴۵۵) نے محمود اور فردوسی کے متعلق کچھ ایسی باتین بھی لکھی ہین جن کی تردید ہو چکی ہے، اس لئے ہم نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے،

غزنی مین بڑی حسین عمارتین تعمیر ہوئین جنکی وجہ سے اس زمانہ مین غزنی کا شمار مشرق کے خوبصورت ترین شہرون مین ہوتا تھا،

محمود مین حکمرانی کمالات بدرجۂ اتم موجود تھے، وہ اپنی رعایا پر عدل و انصاف کے سخت اصولون کے ساتھ حکومت کرتا تھا، تجارت کی ترقی کے لئے اپنی وسیع سلطنت مین ایسا امن و امان قائم کر رکھا تھا کہ تجارتی قافلے خراسان اور لاہور کے درمیان کسی خوف و خطرہ کے بغیر برابر آتے جاتے رہتے تھے، صوبون کے حکام اعلیٰ کو اپنے قابو مین رکھتا تھا کہ وہ لوگون پر ظلم کرنے نہ پائین، اس کا بھائی نصر نیشاپور کا والی تھا، وہ بھی بڑا ہی لائق اور سرگرم حاکم ثابت ہوا، عتبی کا بیان ہے کہ نصر ایسا شریف، رحمدل اور مہربان تھا کہ اسکی زبان سے کبھی کوئی سخت کلمہ ہی نہیں نکلا اور نہ اس نے کسی کو کوئی دکھ پہونچایا،

محمود بازارون پر کڑی نگاہ رکھا کرتا تھا، اور محتسب مقرر کر رکھے تھے تاکہ کوئی تاجر ناپ تول مین بے ایمانی کرنے نہ پائے، وہ رعایا کی خوشحالی کیلئے بڑی بڑی فیاضیان بھی کرتا، عتبی کا بیان ہے کہ اس نے عدل و انصاف اور رعایا کی خوشنودی کے لئے ایک ہزار سرخ دینار خرچ کئے، اسی طرح اُس کی فیاضیون کی اور بھی مثالین ہین،

محمود نے تاریخ مین جو جگہ بنائی ہے اُس کا تعین کرنا کوئی مشکل امر نہین ہے، اپنے عہد کے مسلمانون کی نظر مین تو وہ ایک غازی اور مذہب اسلام کا علمبردار تھا، جس نے کفر کا خاتمہ کر دینا چاہا، ہندوؤن کی نظر مین آج بھی ایک سنگدل اور ظالم لٹیرا ہے، جس نے اُن کی مقدس عبادتگاہون کو ملیامیٹ کر کے اُن کے مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچایا، لیکن ایک غیر متعصب محقق اور مورخ اُس زمانہ کی صورت حال کو پیش نظر رکھکر کچھ اور ہی فیصلہ دینے پر مجبور ہوگا، محمود بلاشبہ اپنے ساتھیون کا ایک جلیل القدر ہیرو تھا، ایک انصاف پسند اور دیانتدار حکمران تھا، ایک باکمال اور پُرجوش سپاہی تھا، عدل و انصاف کا شیدائی تھا، علوم و فنون کا مربی تھا، اور وہ بلاشک و شبہہ دنیا کے بہترین اور عظیم ترین حکمرانون مین شمار کئے جانے کے لائق ہے،

(ص، ع)

وفیات

واحسرتا!

ازجناب مولانا سید سلیمان ندوی

سید فضل الحسن حسرت موہانی مرحوم کی شدت علالت کی خبریں یہاں کے اخباروں میں کئی ہفتوں سے چھپ رہی تھیں کہ دفعتہ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کے ریڈیو میں اُن کی وفات کی خبر آئی، حسرت مرحوم ابھی چند ماہ ہوئے کہ اسی سال ۱۳۶۹ھ کے حج سے فارغ ہوکر جدہ سے کراچی آئے تھے، دیکھا کہ اُن کا گداز جسم ضعف سے سکڑ گیا ہے، اسی وقت خیال آیا کہ یہ حضرت بھی جگہ خالی کرنے والے ہی معلوم ہوتے ہیں، کراچی سے واپس جاکر شاید ہی کچھ دن اچھے رہے ہوں کہ علالت کی خبریں آنے لگیں،

حسرت ضلع اناؤ کے مردم خیز قصبہ موہان میں نیشاپوری سادات کے خاندان میں ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم موہان ہی میں حاصل کی، اس کے بعد اردو مڈل اسکول میں داخل ہوئے، اور اس امتحان میں تمام صوبہ میں ممتاز ہوکر سرکاری وظیفہ حاصل کیا، اور مزید تعلیم کے لئے فتح پور ہسوہ جاکر گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے، اور انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرکے وظیفہ حاصل کیا،

فتح پور ہسوہ کی آب و ہوا حسرت کی ادبی و ذہنی و دینی تعلیم کے لئے بہت راست آئی، یہاں مولانا سید ظہور الاسلام صاحب ایک نہایت متقی و پرہیزگار اور باصفات بزرگ تھے، حضرت قطب الوقت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی کے مرید و خلیفہ تھے، ندوۃ العلماء کے ارکان خاص میں تھے،

اس لئے خاکسار کو بار بار اُن کی زیارت کا موقع ملتا رہا، بلکہ میرے بچپن میں وہ مولانا محمد علی صاحب مونگیری کے ساتھ خاکسار کے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ تشریف لائے تھے، تو پہلے پہل وہیں اُن کی زیارت ہوئی تھی، حسرت مرحوم کو انہی پاک مشرب و پاک نہاد اور پاکباز بزرگ کی صحبت حاصل ہوئی، ان کے علاوہ مولانا نور محمد اور مولانا حبیب الدین صاحب جیسے بزرگوں کا فیض بھی نصیب ہوا، بچپن ہی میں وہ قادری سلسلہ میں مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب فرنگی محلی (جد بزرگوار مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی یعنی جدّ بزرگوار مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی) کے مرید ہو چکے تھے، اسی سلسلہ سے سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے اُن کو عقیدت خاص تھی، اور بزرگان فرنگی محل سے بھی ان کو نسبت حاصل تھی، یہی وجہ تھی کہ ہزاروں انقلابات کے باوجود حسرت اپنی مذہبی زندگی، اور صوفیانہ مشرب میں ہمیشہ غیر متزلزل رہے،

فتح پور ہی میں اُن کی شاعری کی زبان بھی کھلی، کچھ مخصوص احباب کی صحبت میں ادبی ذوق پیدا ہوا، اور عمر کے ساتھ یہ ذوق بڑھتا گیا، فتح پور سے انٹرنس پاس کرکے علی گڈھ میں جاکر داخل ہوئے، وہ ذوق و صحبت اور سلاست لطافت کے اس مرکز میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، سُنا ہے کہ چونکہ وہ شرفائے اودھ کے لباس اور وضع میں تھے، اور ساتھ ہی اودھ کی پرانی وضع کا بڑا سا پاندان بھی ساتھ تھا، کالج کے دستور کے مطابق بے تکلف دوستوں نے ان کو خالہ جان کا خطاب دیا، مگر خالہ جان نے منچلوں کی شرارت اور چھیڑ چھاڑ کی کبھی پروا نہ کی اور اپنے مذاق طبیعت پر قائم رہے، وہاں شعر و سخن کی ایک نئی مجلس اردوئے معلّٰی کے نام سے قائم کی، اور ان کے دم سے شعر و سخن کے چرچے نے بڑی ترقی کی، کالج کے یونین میں بامعنی تقریریں کیں، اور نظمیں سنائیں، اور جلسوں میں اور نواب محسن الملک سے داد تحسین حاصل کی،

مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی، اور مذاق زمانہ کے خلاف کسی علمی ملازمت کے بجائے علم و فن، اور شعر و سخن کی خدمت کا تہیہ کیا، اور اردوئے معلّٰی کے نام سے ایک بلند پایہ ادبی رسالہ علی گڑھ

سے جاری کیا، اس سے دو تین سال پہلے مخزن، لاہور سے نکل چکا تھا، اردوئے معلّی نوجوان جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ادبی خدمت کا دوسرا قدم تھا، مگر مرحوم کی طبیعت میں جو تضاد تھا، اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ اردوئے معلّی کے صحن میں شعر و سخن کے چمنستان کے ساتھ سیاست کا خارستان بھی نظر آیا تھا۔

اُس زمانہ میں جب مسلمان سیاسیات سے جھجکتے تھے، علی گڈہ کا یہ نوجوان بیباک گریجویٹ کانگریس میں شامل ہوگیا، اور ۱۹۰۴ء میں بمبئی کے اجلاس کانگریس میں ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوا اور سورت کانگریس تک برابر شریک رہے، سورت کانگریس کے اختلاف کے بعد یہ تلک کی رہبری میں کانگریس سے الگ ہوگئے،

اردوئے معلّی میں شعر و سخن کے پھول اور سیاسیات کے کانٹے ایک ساتھ ناظرین کے سامنے پیش ہوتے رہے، اور لوگ حسب مذاق اس دو رنگی سے لطف اندوز ہوتے رہے، اس زمانہ کے اردوئے معلّی میں اُن کے اور دوسرے اصحابِ ذوق کے خوب خوب ادبی مضامین نکلے، اُس وقت کی ایک دلچسپ ادبی بحث یاد ہے، اقبال کی شہرت کا آغاز تھا، انھوں نے کسی نظم میں اُن سے کہا "اور اُن کو کہا" کے موقعِ استعمال میں غلطی کی تھی حسرت نے اس پر اُن کو ٹوکا، اور ان دونوں محاوروں کے فرقِ استعمال کو سمجھایا،

پانچ برس تک اردوئے معلّی نکلتا رہا، ۱۹۰۸ء میں اس میں ایک بے نام صاحبِ قلم کا ایک مضمون مصر کے نامور لیڈر مصطفےٰ کامل کی موت پر شائع ہوا، جس میں مصر میں انگریزوں کی پالیسی پر بے لاگ تنقید تھی، یہ مضمون سرکار کی نظر میں قابلِ اعتراض ٹھہرا، اور علی گڈہ کی سلطنت میں بغاوت کا پہلا جرم تھا، نتیجہ یہ ہوا علی گڈہ کالج کی حرمت کو بچانے کے لئے کالج کے بڑے بڑے ذمّہ داروں نے حسرت کے خلاف گواہی دی، یہاں تک کہ نواب وقار الملک نے بھی ایک دو فقروں میں مضمون مذکور کی مذمّت ہی کی پاداش میں حسرت مرحوم کو دو برس کی قید سخت کی سزا ہوئی، ان کا کتب خانہ اور پریس پولیس کے ظلم و ستم کے نذر ہوگیا، اس کتب خانہ میں شعراء کے تذکرے اور دواوین کے بڑے نادر نسخے تھے،

یہاں حسرت کے ایک کیرکٹر کا ذکر کرنا ہے، مضمون مذکور حسرت کا نہ تھا، مگر مقدمہ قائم ہونے پر حسرت نے اُس کو خود اوڑھ لیا، اور باوجود اصرار کے اُس کے لکھنے والے کا نام نہیں بتایا، جہاں تک کان میں پڑی ہوئی بات اس وقت یاد آتی ہے، خیال آتا ہے کہ یہ مضمون اعظم گڈھ کے مشہور شاعر وکیل اقبال سہیل کا تھا، جو اُنھی کی طرح شعر و سخن اور سیاسی مذاق کا انحاد رکھتے تھے،

حسرت مرحوم سے میری ملاقات قید سے چھوٹنے کے بعد ۱۹۰۹ء میں ہوئی، اور وہ اس طرح کہ میں دار العلوم ندوہ سے فارغ ہوکر "الندوہ" کا سب اڈیٹر اور مدرسہ میں مدرس تھا، مدرسہ کے قریب ہی گولہ گنج میں نواب مرشد آباد کے مکان کے ایک کمرہ میں رہتا تھا، یہ وہی مکان ہے جس میں اب اخبار حق کا دفتر ہے، میں اپنی کوٹھری میں تھا کہ ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ باہر ایک صاحب کھڑے ہوئے تم کو بلاتے ہیں، باہر نکلا تو حسرت تھے، میں نے کہا کہ آپ نے تکلیف کیوں کی، اندر کیوں نہیں چلے آئے، اُس زمانہ کی سیاسی حالت کی پستی کا اندازہ کیجئے، حسرت نے جواب دیا کہ چونکہ لوگ مجھ سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں، اس لئے میں نے احتیاط کی راہ سے مطلع کردیا، میں حسرت صاحب کو اپنے کلبۂ احزان میں لایا، اُوپر چھت پر جو کمرہ تھا، اُس میں بستی اور گورکھپور کے کچھ احباب تھے، جو کرسچین کالج میں پڑھتے تھے، آرام کے خیال سے رات کو سونے کے لئے وہاں اُن کے لئے انتظام ہوا، ہاں یہ بتا دینا چاہئے کہ اس وقت سیاست میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوچکا تھا، یہ سردی کا زمانہ تھا، میزبانوں نے اُن کے پائینتی کمبل رکھ دیا تھا، وہ کمبل ولایتی تھا، حسرت نے رات سردی میں اسی طرح کاٹ دی، مگر وہ کمبل نہیں اوڑھا،

اس کے بعد حسرت صاحب کا جب لکھنؤ آنا ہوتا، تو ہمارے دار الاقامہ میں آتے اور سیاست پر باتیں کرتے، اور ملک کے مہاراج کے سیاسی خیالات اور سیاسی عزائم کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے، اور ہندوستان کی آزادی کی پیشین گوئی جس یقین اور عقیدہ کی پختگی کے ساتھ کرتے، اُس پر ہم کو بڑا تعجب آتا،

اور سیاسیات کی ہر مشکل آسان نظر آنے لگتی،

مسلمان ۱۹۰۵ء تک ہندوستان کی سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھے، ایک مدراس کے سید محمد کا نام کانگریس میں کبھی کبھی سنائی دیتا تھا، یا بمبئی کے جسٹس طیب جی کا خیال کبھی کبھی ظاہر ہوتا تھا، مولانا شبلی مرحوم خیال کی حد تک کانگریس کے ساتھ تھے، مگر بہادر نوجوان حسرت پہلا شخص ہے جس نے علی گڈھ کی پالیسی کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا، اور اردوے معلّٰی ادب کے ساتھ ساتھ سیاست کا صحیفہ بھی بنتا گیا، اُسی زمانہ میں دو عالموں کے مضامین کانگریس کی حمایت میں اردوے معلّٰی میں چھپے تھے، جن میں مسلمانوں کو سیاست کی دلیرانہ تعلیم دی گئی ہے، اُن میں ایک مضمون تو حیدرآباد دکن کے ملا عبد القیوم صاحب کا تھا، جو دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کے بانیوں میں سے ایک تھے، اور دوسرا ایک بھوپالی عالم مولوی برکت اللہ صاحب مرحوم کا تھا، جو پہلی جنگ عظیم سے بہت پہلے ہندوستان چھوڑ کر یورپ چلے گئے تھے، اور آخر وقت تک اسلام کی بین الاقوامی سیاست پر مضامین لکھا کرتے تھے، اور ہندوستان کے دوسرے آزادی خواہ ہندوستانی نوجوانوں کی یورپ میں رہبری کرتے تھے، ۱۹۲۶ء تک وہ زندہ تھے، اور سوئزر لینڈ میں قیام تھا، اور خلافت کے احیاء کے لئے کوشاں تھے، وہین انتقال بھی کیا، مسئلۂ خلافت پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی، جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی،

قید سے چھوٹنے کے بعد حسرت کے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ وہ اس سیاست سے باز آجائیں لیکن انھوں نے اس مخلصانہ نصیحت پر کان نہیں رکھا، دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا، اردوے معلّٰی کے قدردانوں نے خریداری ترک کر دی، لوگوں نے ملنے جلنے تک سے احتراز شروع کر دیا، مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

حسرت اپنے عقیدہ میں اور پختہ ہوتے چلے گئے، اور شروع سے جو اصول قائم کیا تھا، اُس میں سر مو فرق آنے نہ دیا،

بوڑھوں میں صرف ایک مولانا شبلی مرحوم تھے جنھوں نے ابتدا میں ہی حسرت کی تائید کی، اور ۱۹۰۳ء میں اردوے معلّٰی کا پہلا سیاسی مضمون پڑھ کر داد دی تھی، اور لکھا تھا،

این کہ گفتی حکایت سحر است — روز روشن ہنوز در قدر است

حسرت مسلمانوں میں سب سے پہلے شخص ہیں، جنھوں نے سودیشی تحریک کی رہبری کی، حسرت ہمیشہ کے غریب تھے، اور یہ غربت ان معنوں میں اُن کی اختیاری تھی کہ کالج کے دوسرے تعلیم یافتوں کی طرح انھوں نے سرکاری نوکری کی راہ اختیار نہیں کی، اور اس امارت اور تعیش کی زندگی پر افلاس اور عسرت کی زندگی کو ترجیح دی، انھوں نے چند آنے گز سے زیادہ کا کپڑا نہیں پہنا، اور ولایتی کپڑے کو ہاتھ نہیں لگایا، اب انھوں نے سودیشی تحریک میں عملاً حصہ اس طرح لیا کہ سودیشی اسٹور کے نام سے سودیشی کپڑوں کی دوکان قائم کی، اور چاہا کہ ملک میں اس کی شاخیں جابجا قائم کی جائیں، اُن کے اس کام میں نواب وقار الملک جو خود بھی اس سادگی پر عامل تھے، اور مولانا شبلی مرحوم نے اُن کی مدد کی، ان دونوں کی سفارش پر مسٹر فاضل بھائی کریم بھائی سے ملے، اور مولانا کی سفارش سے مسٹر فاضل بھائی سے قرض کپڑا خریدا، اور اسٹور قائم کر دیا، اُن کی تجارتی سرگرمی کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم نے اُن سے کہا تھا کہ تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشن بنے، اور اب بنئے ہو گئے، اُن کی یہ دوکان چل نکلی تھی کہ پے درپے سیاسیات کے انقلابات نے ان کو کبھی بنیا بن کر اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیا، اس لئے وہ نفع سے زیادہ خسارہ ہی اٹھاتے ہی رہے،

اسی زمانہ میں مسلمانوں میں کسی سیاسی تنظیم قائم کرنے کا خیال ایک بوڑھے اور ایک پختہ کار جوان کے ذہن میں آیا، یہ بوڑھے نواب وقار الملک اور پختہ کار جوان مظہر الحق صاحب بیرسٹر پٹنہ تھے، مظہر الحق صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ انھیں کی کوٹھی تھی، جس میں سب سے پہلے انھوں نے اور نواب وقار الملک مرحوم نے مل کر مسلم لیگ کا قالب کھڑا کیا، اور شہر ڈھاکہ اس لحاظ سے مبارکباد کے قابل ہے، جہاں خواجہ

سر سلیم اللہ صاحب مرحوم کی دعوت پر سنہ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا پہلا اجتماع ہوا، اس کے بعد تاریخ کے ورق جلد جلد الٹنے لگے، اُس وقت ہندوستان کی سیاست میں بنگال اور پونہ سب سے آگے تھے، اُن کے مقابلہ کے لئے انگریز ہی تھے، جو پس پردہ مسلمانوں کو سیاست کے اسٹیج پر لائے، مگر لحاظ کے قابل یہ ہے کہ جس راہ کو برادرانِ وطن نے پچیس برس میں طے کیا تھا، مسلمانوں نے اسکو صرف چھ برس میں طے کر لیا، اس کے لئے سازگار حالات بھی پیش آئے، جن میں سیاسی جراثیم کو اپنے نشو ونما کے لئے مناسب آب وہوا اور فضا ہاتھ آئی،

۱۔ سب سے پہلی چیز جس نے مسلمانوں میں سیاسی انقلاب کی لہر دوڑائی، وہ سنہ۱۹۱۰ء میں تقسیم بنگال کی منسوخی تھی، بنگالیوں کی سیاست کا زور توڑنے کے لئے لارڈ کرزن نے یہ مناسب سمجھا کہ بنگال کو مشرقی ومغربی بنگال میں تقسیم کر دیا جائے، اس تقسیم سے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو ایسی اکثریت حاصل ہوگئی کہ وہ دفعۃً ہندو بنگالیوں کے سیاسی غلبہ کی دستبرد سے باہر نکل آئے، اور اس لئے مسلمانوں نے اس کا بہت خوشی سے خیر مقدم کیا، لیکن ہندو بنگالیوں نے اس کے برخلاف نہایت شدت اور زور وقوت سے تمام ملک میں تحریک اٹھائی، اور علانیہ باغیانہ مضامین لکھے، اور باغیانہ تقریریں کی جانے لگیں، بلکہ آربند گھوش کی پارٹی نے بم کے گولے بھی اڑا دیئے، مدت تک انگریز اس کو طے شدہ مسئلہ کہکر اپنی ہمت کا اظہار کرتے رہے، مگر بالآخر ان کی طاقت صبر نے جواب دے دیا، اور سنہ۱۹۱۱ء میں بنگال کی تقسیم کو منسوخ کرکے دونوں بنگالوں کو پھر ایک کر دیا،

۲۔ ان کی اس پالیسی سے جو بنگالی ہندوؤں کو رام کرنے کی خاطر کی گئی تھی، مسلمانوں میں بڑی برہمی پیدا ہوگئی، اور بقول مولانا شبلی مرحوم سب سے پہلا باغیانہ مضمون جس نے مسلمانوں کی سیاسی کروٹ بدل دی، وہ نواب وقار الملک مرحوم کا یادگار اور سنجیدہ مضمون تھا، اور اس کے بعد سنہ۱۹۱۲ء میں مولانا شبلی مرحوم کا وہ انقلاب انگیز سلسلہ مضامین تھا، جو مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" کے نام سے "مسلم گزٹ"

لکھنؤ میں چھپا، ان مضامین نے مسلمانوں کی سیاسی ہوا کا رُخ بدل دیا،

۴۔ ابھی یہ آگ لگی ہی ہوئی تھی کہ سنہ۱۹۱۳ء میں کانپور میں ایک مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آیا، جس نے لگی ہوئی آگ میں تیل کا کام کیا، اور پورے ملک میں اس سے آگ سی لگ گئی،

۵۔ یہی زمانہ تھا جب میں آغا خان کی سرپرستی میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک ہندوستان میں کھڑی ہوئی، اور مسلمان اُس کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن چند ہی روز کے بعد یہ سامان سکینت ایک نئے اضطراب کا پیش خیمہ بن گیا، یعنی یہ یونیورسٹی کن اختیارات اور شرائط کے ساتھ لی جائے، اس بحث نے مسلمانوں میں نرم وگرم دو فریق پیدا کر دیئے، اور یہی وہ وقت ہے کہ جب مسلمانوں میں احرار نے جنم لیا، جن کے رہبروں اور رہنماؤں میں محمد علی مرحوم، شوکت علی مرحوم، مولانا ابو الکلام، ظفر علی خان اور حسرت موہانی تھے، اور یہیں سے حسرت موہانی کو سید الاحرار کہا جانے لگا، یوں مسلم لیگ جو ابھی چھ برس پہلے بنی تھی، پر جوش نوجوانوں اور مصلحت اندیش بوڑھوں دو حصوں میں منقسم ہو گئی، اور یہ تفریق روز بروز بڑھتی گئی،

مسلم لیگ میں بھی یہ تفریق روز بروز نمایاں ہو رہی تھی، آغا خان کے بعد راجہ محمد علی محمد خان محمود آباد کا زور بڑھ رہا تھا، مسجد کانپور کے ہنگامہ میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی شخصیت سب سے پہلی دفعہ نمایاں ہوئی، اور سید علی امام وغیرہ کی کوشش سے اس کا اختتام مصالحت پر ہوا، حضرت آغا خان کی لیگ میں شریک نہیں تھے، مگر جیسے جیسے لیگ میں آزادی بڑھتی گئی وہ اُس کے قریب آتے گئے اور اب مسلم لیگ میں داخل تھے،

مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ آگرہ سنہ۱۹۱۳ء میں جو مسجد کانپور کے ہنگامہ کی مصالحت کے بعد ہی ہوا تھا، حسرت شریک تھے، (اور میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا) سر رضا علی کا زمانہ تھا، شب کے جلسہ میں مصلحت پسندوں نے لارڈ ہارڈنگ کے شکریہ کا رزولیوشن پیش کیا، یہ وہ موقع

تھا جب ان مصلحت پسندون کے ساتھ بہت سے احراری بھی اس کی تائید مین تھے، ایسے نازک موقع پر صرف دو نوجوان اس کی مخالفت مین اٹھے، ایک حسرت موہانی اور دوسرے مولوی عبدالماجد بریلوی مرحوم،

اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آیا، اس زمانہ مین مسلمانون کے احساس مین ایسی شدت آگئی تھی کہ ذرا ذرا سی بات سارے ملک مین اشتعال کا باعث ہو جاتی تھی، ۱۹۱۳ء مین مولانا شبلی نعمانی نے دار العلوم ندوہ کی معتمدی سے مخالف ارکان کی مخالفتون سے زچ آکر استعفا دیدیا تھا، دار العلوم کے طلبہ نے اس پر اسٹرائک کی، ایسی پر زور اسٹرائک اس سے پہلے کسی درسگاہ مین نہین ہوئی تھی، سارے ملک مین ہنگامہ بپا تھا، مولانا ابو الکلام کا الہلال اس تحریک کا علم بردار تھا، آج کل کے مشہور مصنف مولانا عبدالسلام ندوی نے جو اس زمانہ مین مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ بمبئی مین بطور مددگار تصنیف کے تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی کے نام جو تعلیم سے فارغ ہوکر ندوہ مین مقیم تھے، ایک خط لکھا تھا، جس مین اُن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ طلبہ مین شورش پیدا کرین، اور آخر مین لکھ دیا تھا کہ یہ مولانا کا حکم ہے، یہ خط مخالفون نے ڈاک سے اڑالیا، اور طلبہ کی اسٹرائک کے بعد انھون نے اخبارات مین اس خط کو شائع کرکے یہ ثبوت بہم پہنچایا کہ یہ اسٹرائک مولانا شبلی صاحب کے اشارہ سے ہوئی ہے، مولانا مرحوم نے اس خط سے اپنی برأت اور لاعلمی ظاہر فرمائی، مولانا عبدالسلام نے اخبارون مین یہ لکھا کہ بے شبہہ یہ میرا خط ہے، اور مولانا کو اس سے کوئی تعلق نہین ہے، مولانا کے استعفے کی منظوری کی خبر سے مجھے اس درجہ تکلیف ہوئی کہ میرا دماغی توازن قائم نہین رہا، اور مین نے یہ لکھ دیا اور زور ڈالنے کے لئے اپنے خیال کو مولانا کی طرف منسوب کردیا، اس پر اخبارون مین مولانا عبدالسلام صاحب پر بحث شروع ہوگئی، اس موقع پر سید حسرت موہانی پہلے شخص ہین جنھون نے لکھا کہ مولانا عبدالسلام صاحب نے جو کچھ کیا وہ بہت ٹھیک کیا، اُن کو معذرت کے بجائے جرأت کے ساتھ یہ اقرار کرنا چاہیئے تھا کہ ندوہ کی اصلاح کے لئے مین اسٹرائک کو آخری علاج سمجھتا تھا"

اس لئے جو کچھ مین نے کیا وہ حق کیا،

بہرحال یہ واقعہ تو لطیفہ کے طور پر درمیان مین آگیا جس سے حسرت کی طبیعت کا رنگ جھلکتا ہے، ذکر مسلم لیگ کا تھا، بمبئی وہ مقام ہے جہان سب سے پہلے مسلم لیگ اور کانگریس کا ملاپ ہوا، یہ ۱۹۱۵ء تھا اور یہی وہ سب سے پہلا اسٹیج تھا، جہان مرحوم محمد علی جناح[1] (قائد اعظم) مسلم لیگ کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے سب سے پہلے ظاہر ہوئے، مظہر الحق مرحوم اس کے صدر اجلاس تھے، انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس بھی یہین تھا، اس سبب سے مسلم لیگ کے اس اجلاس مین ہندو سیاسی لیڈر بھی دوستانہ شریک تھے، ابھی صدارتون کے خطبے ہی ہوئے تھے کہ بات یاد نہ رہی کہ اسٹیج پر حسرت موہانی مرحوم نمایان ہوئے، اور انھون نے کسی چیز کی بڑی شدت سے مخالفت کی، بس ایک ہنگامہ جلسہ مین پیدا ہوگیا، چند پٹھان جوش وخروش سے آگے بڑھے، اور اسٹیج پر قابض ہوگئے، آخر جلسۂ عام ملتوی کرنا پڑا، بعد کو معلوم ہوا کہ انگریز حکام کی تحریک سے یارون کو خوش کرنے کے لئے بمبئی کے بعض سربرآوردون نے کرایہ کے پٹھانون کی مدد سے جلسہ کو درہم برہم کرادیا، غلط فہمی سے لوگ حسرت مرحوم کی نسبت سوئے ظن کرنے لگے، حالانکہ ان سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، یہ اتفاقی بات تھی کہ اس سے معمولی سی بات کو لوگون نے ہنگامہ کا موقع بنالیا،

۱۹۱۴ء والی عالمگیر جنگ روز بروز بڑھتی جارہی تھی، ٹرکی نے اتحادیون کے برخلاف جرمنی کا ساتھ دیا تھا، جس سے مسلمانون کی ہمدردی خواہ مخواہ جرمنی کے ساتھ پیدا ہوگئی تھی، تھوڑے دنون کے بعد انگریزون

[1] شاید لوگون کے لیے یہ بات اچنبھے کی معلوم ہوگی کہ قائد اعظم مرحوم کے نام کا آخری جزو اس وقت تک "جینا" تھا جس کے معنی گجراتی مین پتلے کے ہین، ۱۹۱۶ء مین جب وہ لکھنؤ صدر کی حیثیت سے آئے تو سید جالب مرحوم اڈیٹر ہمدم کی ذہانت نے اس کو جناح بنادیا، جس کے بعد وہ ایسا مشہور ہوا کہ اس نے اصل کی جگہ حاصل کرلی،

خود میرا بھی اس زمانہ کا ایک شعر ہے

ہے مریض قوم کے جینے کی ابھی کچھ کچھ امید ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا "س"

کی سازش سے شریف حسین اور امیر فیصل کی سرکردگی مین ٹرکی سے بغاوت کی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانون مین شریف حسین کے خلاف بھی نفرت پیدا ہوگئی، حضرت مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) اور اُن کے دوسرے رفقا حجاز مین قید ہوکر مالٹا بھیج دیئے گیے، ہندوستان مین بھی بڑے بڑے احرار لیڈر نظر بند کردیے گیے، مولانا ابو الکلام رانچی مین، اور محمد علی مرحوم اور شوکت علی مرحوم چھندواڑہ مین لیکن ابھی تک حسرت آزاد تھے، اور مسلم یونیورسٹی فاونڈیشن کمیٹی مین احرار کی سربراہی کررہے تھے، آخر وہ بھی ۱۹۱۶ء مین پہلے للت پور اور پھر میرٹھ مین قید کردیئے گئے، جس سے جنگ کے بعد چھوٹے، اس قید مین جو مصیبتین حسرت نے جھیلین اور جس طرح ناخوشگوار حالات کا مقابلہ کیا، وہ اخلاق کی پختگی اور عقیدہ کی استواری کی ایک بڑی مثال ہے،

اب مسلم لیگ اور کانگریس یک جان و دو قالب تھے، ایک ہی جگہ دونون کے جلسے ہوتے تھے، اور ایک کے لیڈر دوسرے کے جلسہ مین خاص طور سے ایک وقت شریک ہوتے تھے، اب خلافت کی تحریک شروع ہوئی، مسلم لیگ کے رہنما جن مین اس وقت لکھنؤ کے اندر راجہ صاحب محمود آباد اور چودھری خلیق الزمان، اور دوسری طرف مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی خدام کعبہ کی صدر کی حیثیت سے جس کے سکریٹری شوکت علی مرحوم تھے، اس کی سربراہی کے لئے اُٹھے، راجہ صاحب تو پیچھے رہ گئے، اور سرکاری مناصب مین اُلجھ گئے، چودھری صاحب اور مولانا عبد الباری صاحب باہم ہنرواز ما تھے، اور آخر دونون صاحبون کی شرکت سے خلافت کا یہ پہلا جلسہ مسلم لیگ کے زیر سایہ منعقد ہوا، اس کے بعد خلافت کی تحریک جیسے جیسے زور پکڑتی گئی، مسلم لیگ اُس کے لئے اپنی جگہ خالی کرتی گئی، اب بھی وہ قائم تھی، اور اُس کے جلسے بھی ہوتے تھے، مگر اُس مین کچھ جان نہین رہی تھی، اب خلافت کانفرنس اور کانگریس کا میل بڑھا، اور دونون کے ایک ساتھ اجلاس ہونے لگے،

اس موقع پر ایک بات یاد آئی، تحریک خلافت کے آغاز مین امرتسر کے اجلاس کانگریس دسمبر ۱۹۱۹ء

سے واپسی کے بعد گاندھی جی کے مشورہ سے یہ ضروری سمجھا گیا کہ کام شروع کرنے سے پہلے مسلمان رہنماؤن کا ایک وفد وائسرائے سے دہلی مین ملاقات کرکے اپنے مطالبات پیش کرے، وائسرائے نے ڈیپوٹیشن سے ملنا منظور کیا، اس ڈیپوٹیشن مین نرم گرم ہر قسم کے لیڈر موجود تھے، حکیم صاحب ڈاکٹر انصاری محمد علی شوکت علی وغیرہ سب ہی تھے، خاکسار بھی شریک تھا، اخیر اخیر وقت تک بعض جاہ پسند لوگ اس مین شرکت کے لئے کوشان تھے، اور محرومی سے مایوس نہین ہوتے تھے، لیکن دو مسلمان رہنماؤن کی شان اس مین نرالی رہی، ایک مولانا ابو الکلام آزاد جو مشورون مین شریک تھے، جلسون مین شریک تھے، مگر اس ڈیپوٹیشن مین شرکت منظور نہین کی، حکیم صاحب وغیرہ نے ہر چند اصرار کیا مگر اُن کا انکار ہر اصرار پر غالب رہا، مگر اس سے زیادہ نرالی شان حسرت موہانی کی رہی، مولانا ابو الکلام والے طریق سے اپنی ذات کی بڑائی کا اظہار نمایان ہوتا تھا، مگر حسرت نے یہ کیا کہ ایک طرف تو خاموشی کے ساتھ ڈیپوٹیشن مین شرکت کی، اور وائسرائیگل ہال مین ڈیپوٹیشن کے ممبرون کے ساتھ موجود تھے، لیکن عرض و معروض و جواب کے بعد جب وائسرائے سے ہاتھ ملانے کا اعزازی لمحہ آیا، تو مین نے دیکھا کہ حسرت چپکے سے اُٹھ کر بے ہاتھ ملائے کترا کر اس طرح نکل گئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہین،

اس کے بعد ترک موالات کی تحریک اُٹھی، ۱۹۲۰ء کے دسمبر مین ناگپور مین کانگریس کا اجلاس تھا، یہی وہ اجلاس ہے جس مین کانگریس نے ترک موالات کی تحریک منظور کی، اس مین حسرت مرحوم اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ موجود تھے،

یہ بات یون یاد رہی کہ واپسی مین ہجوم اتنا تھا کہ ریل کا سفر دشوار معلوم ہوتا تھا، حسرت صاحب نے ہمت دلائی کہ تم میرے ساتھ چلو، چنانچہ اسٹیشن پہونچا، تو دیکھا کہ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبہ مین حسرت مع اپنی بیگم صاحبہ کے بیٹھے ہین، اور اس مین اتنا ہجوم ہے کہ سر کے سوا کچھ معلوم نہین ہوتا تھا، کسی طرح سوار ہوا تو دیکھا کہ ایک درگ بچھائے پر حسرت صاحب متمکن ہین، مٹی کا لوٹا اور مٹی کے برتن ساتھ ہین، اسی مین

کھاتا پیتا ہے، ہجوم کی کوئی پرواہ نہین ہے، دوسری طرف پنڈت موتی لال کا سامان فرسٹ کلاس کے ڈبہ مین لگ رہا ہے، اور وہ آرام سے اُس مین سوار ہو رہے ہین، اس وقت میری زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ سیاسی جھگڑون کا سفر وہی آدمیون کے لئے موزون ہے، حسرت جیسے بے نوا، یا موتی لال جیسے باسروسامان کیلیے،

اس کے بعد واقعتاً مجھے کانگریس کے کسی اجلاس مین شرکت کا موقع بہت کم ملا،

اب ۱۹۲۰ء کا سال آیا جب گاندھی جی کانگریس پر چھائے تھے، اور ادھر خلافت کے لیڈر محمد علی شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر کچلو، ظفر علی خان، تصدق شروانی، ڈاکٹر محمود، مولانا ابوالکلام، حسرت موہانی وغیرہ تھے، ترک موالات کا زور تھا، اخیر دسمبر ۱۹۲۰ء گاندھی جی نے ہندوستان کے سوراج ملنے کی آخری تاریخ مقرر کی تھی، احمد آباد مین کانگریس کا یہ تاریخی جلسہ تھا، محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام نظر بند تھے، باقی حضرات شریک تھے، ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ساتھ اجلاس مین مین بھی تھا، اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانون کی قیامگاہ کے سامنے ایک شامیانے مین مغرب کے بعد خاص مسلمانون کا جلسہ تھا، حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے، گاندھی جی خاص طور سے مسلمانون سے کچھ کہنے کے لئے آئے ہوئے تھے، اتنے مین دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے بھاگتے ہوئے دو والنٹیر آئے، اور گاندھی جی سے نہایت اضطراب کے ساتھ کہا جلدی چلئے، سبجکٹ کمیٹی مین حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کے استقلال (انڈیپنڈنس) کی تجویز پیش کر دی ہے، اور کسی طرح واپس نہین لے رہے ہین، فضا مین ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی گولا آکر پڑا ہے، چنانچہ گاندھی جی وغیرہ بھی گھبرائے ہوئے جلسہ سے اٹھ کر سبجکٹ کمیٹی مین چلے گئے، مگر حسرت ع

یہ وہ نشہ نہین جسے ترشی اتار دے

حسرت بدستور اپنی بات پر جمے رہے، اور نوٹس دیا کہ وہ اس کو کھلے اجلاس مین پیش کرین گے، چنانچہ وہ وقت آیا جب کھلے اجلاس مین حسرت نے ہندوستان کے استقلال کی تجویز پیش کی، اور انھون نے دیکھا کہ ہزارون

کے مجمع مین ایک آواز بھی اُس کی تائید مین نہین اٹھی، پھر نیرنگ قدرت کا تماشا دیکھئے کہ اُس کے آٹھ برس کے بعد لاہور کے اجلاس کانگریس مین ۱۹۲۹ء مین پنڈت جواہر لال نے یہی ریزولیوشن پیش کیا اور کانگریس نے اس کا خیر مقدم کیا، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی خودمختاری کا پہلا اعلان حسرت موہانی کی زبان سے ہوا، اس کے بعد وہ گاندھی جی کی کانگرس سے بھی علحدہ ہو گئے، حسرت مرحوم نے مجھ سے ایک دفعہ کہا تھا کہ گاندھی جی جینی فلسفی کی طرح ہر کلام مین دو متضاد پہلو رکھتے ہین اور بیک وقت دونون کو حق سمجھتے ہین،

کمیونزم، اور بالشویزم کے ظہور کے بعد اقتصادی امور مین اُن کا میلان اس کی طرف بھی ہو گیا تھا، اور اپنے کو مسلمان کمیونسٹ کہتے تھے، اُن کی عقیدت اس باب مین یہان تک تھی کہ تقسیم سے چند سال پہلے وہ مسلم لیگ کے کسی وفد کے ساتھ اعظم گڈھ آئے تھے، تو دارالمصنفین بھی تشریف لائے، دورانِ گفتگو مین ایک تازہ سیاسی نظم سنائی، جس کا ایک قافیہ سَوِیَّت تھا، اور وثوق کے ساتھ فرمایا کہ روسی لفظ سوویٹ حقیقت مین عربی لفظ سَوِیَّت ہے، جس کے معنی برابری کے ہین،

کانگرس کے ہٹنے کے بعد ایک اور سیاسی پارٹی مولانا آزاد سبحانی کے ساتھ مل کر قائم کی تھی، مگر وہ چل نہ سکی، کانگرس اور لیگ کے متفقہ الکشن کے بعد جب مشترکہ لیگ و کانگریس وزارت بنانے کا اصول کانگرس نے تسلیم نہین کیا، اور مسلم لیگ نے نئے جوش و خروش کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک نیا دور شروع کیا، اور ایک نئے مقصد حیات کی طرح ڈالی تو حسرت موہانی مرحوم نے مسلم لیگ مین بیش از بیش شرکت کی، یہان تک کہ وہ کانگرس سے بالکل علحدہ ہو کر خالص لیگی ہو گئے، اور اُن کوششون مین شریک ہو گئے، جو مسلم لیگ پاکستان کے حصول کے لئے کر رہی تھی، وہ اس کی مجلسِ عاملہ کے ارکانِ خاص مین تھے، لیکن یہان بھی ان کی شان نرالی تھی، قائد اعظم مرحوم کسی اختلاف کو کم برداشت کر سکتے تھے، مگر ایک حسرت موہانی کی ذات تھی جو اپنے خیال مین جس کو حق سمجھتے تھے،

اُس کے اظہار میں کسی سے مرعوب نہیں ہوئے، بلکہ وہی ہیں جنھوں نے مسلم لیگ میں بھی استقلال اور خود مختاری کا رزولیوشن پیش کیا،

پاکستان بننے کے بعد انھوں نے ہندوستان ہی میں قیام پسند کیا، اس کی پارلیمنٹ کے ممبر رہے، اور تنہا وہ تھے جو پوری پارلیمنٹ کی مخالفت کے باوجود اپنی رائے کے اظہار میں بے باک تھے، نہ کسی کے غصہ پر دھیان اور نہ کسی کی ہنسی کی پروا، نہ کسی کی تحقیر پر افسوس، نہ کسی کی نفرین کا جواب، ایک دھن تھی جو اُن کو اپنی منزلِ مقصود کی طرف لئے چلی جارہی تھی،

حسرت خواہ کسی قدر بے ضرر رہے ہوں مگر انگریزی عہد میں وہ بڑے خطرناک سمجھے جاتے تھے، وہ کہیں جائیں، ایک خفیہ پولیس کا آدمی اُن کے ساتھ رہتا تھا، اسٹیشنوں پر اُن کی آمد کی اطلاع کر دی جاتی تھی، مگر وہ بھی عجیب دلچسپ آدمی تھے، ہمیشہ پولیس اور ریلوے کے آدمیوں کو انھوں نے دھوکہ دیا، وہ کہتے تھے کہ میں ٹکٹ منزلِ مقصود سے آگے پیچھے کا لے لیتا ہوں، اور بیچ میں اُتر جاتا ہوں، پولیس حیران ہوتی ہے، کبھی یہ کرتے کہ اپنے بجائے دوسرے کو بھیج کر ٹکٹ منگوا لیتے، اور چلے جاتے، پتہ بھی نہ چلتا، پھر یہ ہونے لگا کہ درمیانِ راہ میں اُن کے ٹکٹ کا نمبر چیک ہوتا،

ایک دفعہ یہ ہوا کہ ٹکٹ چیکر مسافروں کے ٹکٹ دیکھنے لگا، حسرت تاڑ گئے، وہ چکر کاٹ کر دوسری طرف چلے گئے، ٹکٹ چیکر کو جب خوب حیران کر چکے، تو سامنے آکر فرمایا، کیا تم یہ نمبر ڈھونڈ رہے ہو، اس سے زیادہ لطیفہ یہ ہوتا تھا کہ وہ راہ میں کسی سے اپنا ٹکٹ بدل لیتے تھے، حسرت تو اسٹیشن سے اتر کر چلتے ہوتے، اور دوسرا ناکردہ گناہ حسرت بنا، پولیس کو احمق بنا رہا ہے،

ایک دفعہ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، خدا جانے کسی جلسہ کی تقریب سے میں اور وہ دونوں دلّی میں تھے، مغرب کے بعد حسرت نے کہا چلو کامریڈ کے دفتر میں کوچہ چیلان چلیں، راستہ نہ انھیں یاد تھا نہ مجھے، فرمایا چلو ایک رہبر ساتھ ہو اُس سے پوچھیں، انھوں نے ایک صاحب کو پکارا کہ بھئی چھپ چھپ

کے کیوں چل رہے، ساتھ چلو، ذرا کامریڈ کا دفتر بتاؤ، اب وہ صاحب سامنے آئے، تو میں نے دیکھا کہ کسی عربی مدرسہ کے طالب العلم کے لباس میں ایک صاحب ہیں، وہ بے تکلف آگے آگے چلے، اور ہم لوگ پیچھے پیچھے، حسرت نے کہا یہ ہمارے ہمزاد ہیں، یہ یا اِن کے بھائی ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں، اور ایسے مشکل وقتوں میں وہ کام آتے ہیں،

اب تک جو گفتگو کا سلسلہ چلا آیا وہ سارا سیاسی تھا، حسرت پکے دیندار تھے، وہ کانگریسی بھی رہے اور اپنے کو سوشلسٹ بھی کہتے تھے، مگر بچپن سے موت تک وہ سچے اور پکے اور دیندار مسلمان رہے، وہ نہ صرف مسلمان، بلکہ صوفی مسلمان تھے، اور صوفیوں میں بھی وہ صوفی تھے، جن سے بزرگوں کا کوئی مزار اور کوئی عرس اور کوئی قوالی کی مجلس چھوٹتی نہ تھی، خصوصاً فرنگی محل اور ردولی کی مجلسیں،

حجاز پر ۱۹۲۴ء میں ابن سعود کے قبضہ کے بعد سے چونکہ وہ وہابیت سے ناراض تھے، اس لئے وہ اس قبضہ سے خفا تھے، لیکن با ایں ہمہ انھوں نے حرمین کی زیارت کی توفیق انھیں وہابیوں کے عہد میں پائی، اس حج کے بعد وہ وہابیوں سے خفگی کے باوجود کچھ ایسے اس سرزمینِ اقدس کے دلدادہ ہوئے کہ چند سال ہوئے متواتر ہر سال حج کو جاتے رہے، اور حکومت کے مہمان ہوتے رہے،

حسرت جیسی متضاد طبیعت کا انسان شاید ہی منصۂ شہود پر آیا ہو، سیاسیات اور قید و بند کے ساتھ شعر و سخن کی چمن بندی اور آبیاری بہت کم جمع ہو سکتی تھی، لیکن حسرت کے مزاج میں دونوں چیزیں جمع تھیں، اور خود حسرت کو بھی اس اجتماعِ ضدین پر تعجب تھا، جیسا کہ خود ہی کی ایک غزل میں انھوں نے کہا ہے

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کو نسیم دہلوی، اور تسلیم لکھنوی کے سلسلہ سے شعر و سخن کی سجادگی ملی تھی، غزل کو لکھنؤ کے

تصنع اور غالب کی شکل گوئی کے کوچہ سے سادگی اور آسان گوئی، اور حقیقت رسی کی منزل تک پھیر کر لانا شاعری مین حسرت کا تجدیدی کارنامہ ہے، حسرت کا مکمل دیوان ابھی تک مکمل نہین ہوا ہے، متفرق دواوین چھوٹے چھوٹے دیوانون کی صورت مین اکثر چھپتے رہے، اور بیچاری بیگم حسرت جب تک جیتی رہین، شوہر کی قید کی صورت مین اکثر وہ ان کے دواوین مختلف ترتیبون سے چھپوایا کرتی تھین، ضرورت ہر کہ حسرت کا ایک مکمل دیوان صحت واہتمام کے ساتھ یادگار کے طور پر چھپوایا جائے، اور ان کی دوسری سیاسی اور ادبی تحریرون کو جمع کیا جائے، حسرت کی ادبی تصنیفات مین اُن کی شرح دیوانِ غالب بہترین چیز ہے، اسی طرح متروکات اور معانی شعر پر ان کے رسائل اور مقالات یادگار رہی چیزین ہین،

حسرت کی زندگی کا تذکرہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی وفادار شریف اور بہادر بیگم مرحومہ کے تذکرہ کے بغیر تمام نہین ہوسکتا، آج سے پینتیس برس پہلے وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس مین باہر آتی تھین، اور کسی کی پروا نہیں کرتی تھیں، شوہر کی ہر قید و بند کے بعد جب اُن کا کوئی مونس و مددگار نہین ہوتا تھا، ہر قسم کی مشکلون کو بہادری اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے مین شاید ہی کوئی مسلمان عورت اُن کے مقابلہ کی نکل سکے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے،

سید فضل الحسن حسرت موہانی کی زندگی کے واقعات پر نظر کر کے اُن کی شان حضرت ابوذر صحابیؓ کی نظر آتی ہے، جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"ابوذر سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہین چمکی"

سچ یہ ہے کہ اس عہد پر فریب مین حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی، اسی طرح حضرت ابوذرؓ کے بعد یہ قول نبوی بھی اُن پر صادق آتا ہے کہ "ابوذر کی حق گوئی نے اُس کو زندگی مین تنہا چھوڑ دیا، اوس کا کوئی ساتھی نہین رہا" اور اس لئے اس عہد مین اس مقدس فقرہ کا مورد

بھی حسرت کی وفات تھی،

عاش فریداً مات حمیداً تنہا جیا اور ستودہ مرا

حسرت کا دماغ خدا جانے کتنے روپون مین جلوہ گر ہوا، مگر اُس کا دل بزرگون کی عقیدت کی خاک سے بنا تھا، مرتے دم پیر کے آستانہ پر جان دی، اور انہی کی ابدی خواب گاہ مین آرام کیا، مولانا انوار صاحب کے باغ مین جہان فرنگی محل کے خدا جانے کتنے خزانے دفن ہین، حسرت بھی اپنی تمناؤن کے خزانہ کے ساتھ دفن ہوئے،

حسرت! رخصت تو تنہا آیا تھا، تنہا رہا، تنہا گیا، البتہ تیری نیکی، تیری شرافت، تیرا اخلاص اور حسنِ عقیدت کے اعمال تیرے ساتھ ہین، اور وہی تیرے رفیقِ آخرت ہین، بارالٰہا! اُس کی حق گوئی کی بےکسی کی شرم رکھ لیجئے، اور اس کو اپنی رفاقت سے نوازے، وانت الرفیق الاعلیٰ،

۱۰ رمضان المبارک سنہ ۱۳۷۰ھ،

تابعینؒ

علم و عمل اور مذہب و اخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس مین حضرت عمرؓ بن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات کارنامون کی تفصیل ہو، (مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی اڈیٹر معارف) قیمت صہ "منیجر"

ادبیات

ارضِ پاکِ بطحا

از جناب شفیق جونپوری

جب روضۂ انور کا منارا نظر آیا
معلوم ہوا عرش کا تارا نظر آیا

وہ گنبدِ محبوب دل آرا نظر آیا
بیمار کو جینے کا سہارا نظر آیا

وہ شانِ تجلی کہ ہر اک ذرہ کا ذرہ
خورشید جہانتاب کا پیارا نظر آیا

سورج کی تمازت ہو کہ ہو گرم ہوا میں
سب کچھ دلِ شیدا کو گوارا نظر آیا

اللہ رے ببولوں کے درختوں کی قطاریں
ہر خارِ مغیلان چمن آرا نظر آیا

عربوں کے قبیلوں کی وہ آزادیٔ معیشت
فطرت کے تقاضوں کا اشارا نظر آیا

تپتا ہوا صحرا کہیں چھپر کہیں خیمہ
برسات کے پانی پہ گزارا نظر آیا

باتوں میں بناوٹ نہ مزاجوں میں تصنع
تھا کہ عجب حسنِ خود آرا نظر آیا

تہذیب حیا مانع گفتار و تکلم
چہرہ مگر افلاس کا مارا نظر آیا

پوچھو نہ کڑی دھوپ میں چھپر کا وہ سایا
فردوس کے خیموں سے بھی پیارا نظر آیا

منزل پہ تکلف سے بری ٹاٹ کا خیمہ
طیبہ کے مسافر کا سہارا نظر آیا

پہونچا ہے سرِ بیرِ علی تشنۂ دیدار
یا چشمۂ کوثر کا کنارا نظر آیا

حیرت ہے کہ جو بوسہ گہِ روح امین ہے
اس در پہ شفیق سخن آرا نظر آیا

مطبوعات جدیدہ

ولی گجراتی مرتبہ جناب ڈاکٹر سید ظہیر الدین صاحب مدنی تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۵ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ انجمن ترقی اسلام اردو انسٹی ٹیوٹ نمبر ۹۲، ہار بنی روڈ بمبئی نمبر ا۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، اردو زبان و ادب خصوصاً گجرات کی قدیم ادبی یادگاروں کی تحقیقات اور اُن کی اشاعت کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے، جس کے نتائج اس کے رسالے نوائے ادب میں نکلتے رہتے ہیں، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی اور ولی گجراتی یا دکنی کے حالات میں ہے، اس میں حسب ذیل مباحث ہیں، ولی کا زمانہ، سوانح حیات، ولی کی علمی استعداد، ولی اور اردو زبان ولی کے مرغوب فارسی شعراء، ولی کے کلام میں ہندوستانی عنصر، ان سب مباحث پر محققانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، ولی کے بہت سے حالات ایک عرصہ تک پردۂ خفا میں رہے، چنانچہ اُن کے نام و وطن، سنہ پیدایش و وفات اور اُن کی علمی استعداد وغیرہ کے بارہ میں بھی بڑا اختلاف رہا، مگر ادھر چند برسوں کے اندر ان کے متعلق کافی تحقیقات ہو چکی ہے، اور بہت سے حالات روشنی میں آچکے ہیں، تاہم اب بھی بعض امور مختلف فیہ اور تحقیق طلب تھے، فاضل مصنف نے اس کتاب میں اُن کی تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے، اور ولی کے کلام کا بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے، اس کے بعد ولی کے گجراتی ہونے میں کوئی شک وشبہہ باقی نہیں رہ جاتا، ولی کے زمانہ کے ضمن میں اس دور کے سیاسی انقلابات، اُن کے اثرات ونتائج اور گجرات کی مختصر علمی تاریخ بھی تحریر کر دی ہے، اُن کے کلام پر تبصرہ کے سلسلہ میں اس کی خصوصیات، اس میں ہندوستانی اثرات اور اردو زبان سے متعلق ولی کی اصلاحی خدمات وغیرہ کی تفصیل بیان کی ہے، ولی کی علمی استعداد

کے دلائل البتہ کمزور ہیں، اُس زمانہ میں مختلف آیات قرآنی اور مشہور احادیث نبوی کے معانی و مطالب اور اسلامی علوم و فنون کی رائج اصطلاحوں سے بہت سے غیر عربی دان تعلیم یافتہ بھی واقف ہوتے تھے اس لئے ولی کے کلام میں ان کا پایا جانا، ان علوم سے ان کی درسی واقفیت کا ثبوت نہیں، مگر یہ مسلم ہے کہ ولی متداول علوم سے ناآشنا نہ تھے، مجموعی حیثیت سے ولی کے حالات میں یہ کتاب محققانہ اور اُردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے،

داستانِ ادب حیدرآباد مرتبہ جناب سید محی الدین صاحب زور قادری تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، غیر مجلد عہ، پتہ:- سب رس کتاب گھر، خیرت آباد حیدرآباد دکن،

اردو کا سب سے قدیم گہوارہ دکن اور گجرات ہے، اسی سرزمین سے اس کی نظم و نثر کی ابتدا ہوئی خصوصاً حیدرآباد نے اردو زبان کی اتنی خدمات انجام دیں کہ اسکی مثال ہندوستان کا کوئی خطہ نہیں پیش کر سکتا، وہ صدیوں سے دکن کا پایۂ تخت اور مختلف فنون کے اصحاب علم و کمال کا مرجع رہا، اور اس طویل مدت میں وہاں اردو، عربی اور فارسی زبانوں اور ان کے علوم و فنون کی بڑی خدمات انجام پائیں جس کا سلسلہ ریاست حیدرآباد کے خاتمہ تک برابر قائم تھا، لائق مؤلف نے اس کتاب میں اختصار کے ساتھ حیدرآباد کی تین صدیوں کی علمی سرگذشت بیان کی ہے اور حیدرآباد کے بانی محمد قلی قطب شاہ کے عہد ۱۰۰۰ھ سے لیکر موجودہ زمانہ تک مختلف دور قائم کرکے ہر دور کی علمی و ادبی تحریکات، سلاطین و امرار کی علم دوستی، اور کمال پروری، اصحاب علم و کمال، شعرار و ادبار، علما و مصنفین، اور اُن کے علمی و ادبی خدمات، اور اُن کی نظم و نثر کی تصانیف کا مختصر تذکرہ کیا ہے، اس طرح اس میں اختصار و جامعیت کے ساتھ حیدرآباد کی پوری علمی تاریخ آگئی ہے، مضامین سے متعلق سلاطین و امرار، اور اربابِ کمال کی ۳۳ عکسی تصویریں بھی ہیں، اور آخر میں اسماء و اعلام کا انڈکس ہے،

حیاتِ اکبر ضخامت ۲۳۱ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ہے مرتبہ: بزم اکبر کراچی،

بزم اکبر نے جو حال ہی میں حضرت اکبر الٰہ آبادی کی یادگار میں کراچی میں قائم ہوئی ہے، ان کی یہ سوانح عمری شائع کی ہے، مرحوم کی شخصیت اور اُن کے گوناگون اوصاف و کمالات اور ادبی و اصلاحی خدمات کے لحاظ سے اُن کی سوانحعمری اب سے بہت پہلے شائع ہو جانی چاہیے تھی، مگر اب تک یہ کام نہ ہو سکا تھا، ان کے صاحبزادے سید عشرت حسین مرحوم نے عرصہ ہوا، ایک سوانح عمری لکھی تھی، جو اب تک مسودہ کی شکل میں تھی، مگر اس میں تصنیفی حیثیت سے بعض خامیاں تھیں، ملا واحدی صاحب دہلوی نے جو کہنہ مشق اہل قلم ہیں، اس میں ترمیم و اصلاح کرکے از سر نو اس کو مرتب کیا ہے اور جابجا تشریحی حواشی تحریر کئے ہیں، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی اور خواجہ حسن نظامی صاحب کے قلم سے بھی جن کو مرحوم کے ساتھ خصوصی تعلقات تھے، مفید حاشیے اور تعلیقات ہیں، کتاب کے شروع میں ان دونوں کے مقدمے اور دیباچے بھی ہیں، کتاب کے آخر میں ہندوستان کے بہت سے اکابر کے وہ تعزیت نامے بھی نقل کر دیئے گئے ہیں، جو انھوں نے حضرت اکبر کی وفات پر لکھے تھے، اگرچہ اس سوانح عمری میں مرحوم کے ضروری ذاتی حالات آگئے ہیں اور خود اُن کے صاحبزادے کے قلم سے جس سے زیادہ مستند دوسرا ذریعہ نہیں ہو سکتا، لیکن مرحوم کے کارناموں کے لحاظ سے یہ سوانح عمری بہت مختصر ہے، اور اس سے اُن کی شخصیت اور کمالات و خدمات کا پورا اندازہ نہیں ہوتا، تاہم کچھ نہ ہونے کے مقابلہ میں یہ مختصر سوانحعمری بھی غنیمت ہے، ضرورت اسکی ہے کہ اس کا دوسرا حصہ بھی مرتب کیا جائے، جس میں مرحوم کی حکیمانہ شاعری کی خصوصیات، اور اُن کے اصلاحی و ادبی کارناموں اور اُس کے اثرات و نتائج کو پوری تفصیل کے ساتھ دکھایا جائے، تاہم یہ سوانح عمری بھی حضرت اکبر کے قدردانوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے،

نالۂ شاد از جناب رام پرشاد کھوسلہ تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت للعہ، پتہ اقبال بک ڈپو مقابل پٹنہ کالج ڈاکخانہ مہندرو پٹنہ نمبر ۶،

"نالۂ ناشاد" اردو کے مشہور اور کہنہ مشق شاعر رام پرشاد گھوسلہ آنجہانی کے کلام کا مجموعہ ہے، ان کے کلام کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، اگرچہ گھوسلہ جدید تعلیم یافتہ تھے، اور ان کی ساری زندگی اسی ماحول میں گذری، مگر وہ ہماری پرانی مشترک تہذیب کی یادگار اور اس کی تمام خصوصیات کے حامل تھے، ان کا مذاق خالص مشرقی اور صوفیانہ تھا، اس لئے یہی اثرات ان کی شاعری میں بھی آئے، چنانچہ ان کے کلام میں عارفانہ حقائق، باطنی کوائف اور اخلاقی تصورات کا اثر غالب ہے، وہ نظم زیادہ کہتے تھے، اس لئے اس مجموعہ میں بیشتر حصہ نظموں کا ہے، تاہم غزلوں کا بھی حصہ خاصہ ہے، نظمیں زیادہ تر باطنی جذبات و تاثرات پر مشتمل ہیں، غزلوں میں بھی تغزل کے ساتھ ساتھ سوز و ساز کی کیفیتیں نمایاں ہیں، زبان نہایت صاف و شستہ، خیالات میں بلندی و پاکیزگی کے ساتھ کیف و اثر بھی موجود ہے، غرض نالۂ ناشاد مصنف کی کہنہ مشقی کا نمونہ اور شاعری کے تمام ظاہری و معنوی محاسن سے آراستہ ہے، کتاب کے شروع میں آنریبل ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر ترقیات صوبہ بہار اور پروفیسر عبدالمنان بیدل کے قلم سے مصنف کے ذاتی حالات اور ان کے کلام پر نقد و تبصرہ ہے،

کلیاتِ اکبر الہ آبادی حصہ اوّل — اکبر الہ آبادی مرحوم، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۴۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، قیمت مجلد ۷ر، پتہ: بزم اکبر کراچی،

حضرت اکبر کے کلیات کا یہ حصہ بزم اکبر نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، مرحوم کی زندگی میں جو کلیات شائع ہوا تھا، اور جس کو انھوں نے خود مرتب کیا تھا، اس میں دورِ سوم کا کلام پہلے تھا، اور دوم کا درمیان میں، اور دورِ اول کا سب سے آخر میں تھا، اس اڈیشن میں تینوں دوروں کی ترتیب زمانہ کے لحاظ سے کر دی گئی ہے، یعنی پہلے دورِ اول کا کلام، اس کے بعد دورِ دوم کا، اور آخر میں دورِ سوم کا، اس سے کلام کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے،

"ض۔ م"